Regd. L. No. 7243

Phone 880800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

مارچ 1981

اس پرچہ میں :-

ریفرنڈم کی ضرورت کیا ہے؟

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵ بی - گلبرگ - لاہور

قیمت فی پرچہ 3 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

ٹیلی فون
۸۸۰۸۰۰

قیمت فی پرچہ
۳
تین روپے

خط و کتابت
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور

سالانہ
پاکستان -/۳۶ روپے
غیر ممالک -/۴ پونڈ

شمارہ ۳ | مارچ ۱۹۸۱ء | جلد ۳۴

فہرست

۱۔ لمعات ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲

مکّے نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام ۔۔۔ جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم

۲۔ شناسائے اقبالؒ ۔۔۔ سید نذیر نیازی (مرحوم) ۔۔۔۔ (محترم پرویز صاحب) ۔۔۔۔ ۱۳

۳۔ پاکستان خود ایک ریفرنڈم کے نتیجہ میں وجود میں آیا تھا! ۔۔۔۔ (محترم پرویز صاحب) ۔۔۔۔ ۱۷

۴۔ طلوعِ اسلام کا مسلک و مقصد ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۳۱

۵۔ اسلامی مملکت کے سربراہ کی معاشی ذمہ داریاں ۔۔۔۔ (محترم پرویز صاحب) ۔۔۔۔ ۳۳

۶۔ تحریکِ پاکستان کی کہانی (طلوعِ اسلام کی زبانی) ۔۔۔ قسط اوّل ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۹

۷۔ قرآنی درس کے اعلانات ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۶۴

(۰)

ایڈیٹر محمد خلیل ۔ ناشر سراج الحق ۔ مقامِ اشاعت ۔ ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور ۔ مطبوعہ ۔ اشرف پرنٹنگ پریس ۹ ایبک روڈ ۔ لاہور

باسمہٖ تعالیٰ

لمعات

مکّے نے دیا خاک جنیوا کو یہ پیغام
جمعیّتِ اقوام کہ جمعیّتِ آدم

اواخر جنوری ۱۹۸۱ء میں، طائف میں سربراہانِ مملکتِ اسلامیہ کی تیسری کانفرنس کے افتتاحیہ اجلاس کا منظر ٹیلی ویژن پر دکھایا گیا۔ یہ منظر جہاں نہایت دلکشا تھا وہاں بغایت جگر گداز بھی تھا۔ اس میں دکھایا یہ گیا تھا کہ (۳۸) آزاد مسلم مملکتوں کے سربراہ حرمِ کعبہ میں، بیت اللہ کی دیوار کے سائے تلے، سیاسی گتھیاں سلجھانے میں مصروفِ بحث و تمحیص ہیں۔ منظر کا یہ گوشہ دلکشا تھا۔

اسلام (قرآنِ مجید) نے دنیا کو ایک نیا انقلاب آفریں پیغام دیا تھا۔ اور وہ تھا وحدتِ انسانیت کا پیغام۔ اس وقت نوعِ انسان۔ خون۔ نسل۔ رنگ۔ زبان۔ وطن کی تمیز و تفریق کی بنا پر مختلف قبیلوں اور قوموں میں بٹی ہوئی تھی اور "قیامت تھی کہ انساں، نوعِ انساں کا شکاری تھا"۔ اسلام نے کہا کہ یہ تفریق و تقسیم مقصدِ تخلیقِ انسانی کے خلاف ہے۔ تمام انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں جن میں کسی قسم کا اختلاف و افتراق نہیں۔ سوال یہ تھا کہ اس قدر مختلف اور متنوع ٹکڑوں میں بٹی ہوئی نوعِ انسان کو ایک عالم گیر برادری کے قالب میں ڈھالا کیسے جائے؟ اس نے کہا کہ ایسا، زندگی کے مقصد کی وحدت سے ہو سکے گا، جسے ایمان کا اشتراک کہتے ہیں۔ یعنی جب مختلف افراد کے نزدیک زندگی کا مقصد (جسے ان کے خدا نے متعیّن کیا تھا) ایک ہو گا تو وہ خود بخود ایک برادری کی شکل اختیار کر لیں گے۔ اس عظیم عالمگیر مقصد کے حصول کے لئے، اس نے آغازِ کار ایک چھوٹی سی جماعت سے کیا جسے اُمّتِ مسلمہ، یا اُمّتِ محمدیہ کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس اُمّت کی ایک مملکت تھی۔ ایک ضابطۂ حیات (قرآن) تھا۔ ایک مرکزِ ملّت (سربراہ تھا) اور ایک مرکزِ محسوس تھا جسے کعبہ کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ مقامی طور پر تو اس مملکت کے نمائندگان باہمی مشاورت کے لئے مساجد میں جمع ہوتے تھے لیکن ان کا عالمگیر اجتماع، کعبہ میں ہوتا تھا جہاں باہمی مشاورت سے، ملّت کے اجتماعی مسائل کا حل تلاش کیا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ اُمّت اور اس کی مملکت دُور دُور تک پھیل گئی، لیکن ان کی اجتماعیت کا نقشہ وہی رہا ——— یعنی ایک مملکت۔ اس کا ایک ضابطۂ حیات۔ ایک مرکزی اقتدار۔ اور ایک مقامِ مشاورت ——— یہ تھا اسلامی نظام کا محسوس نقشہ۔

اس کے بعد مسلمانوں میں ملوکیت آگئی۔ یعنی خدا کی حکمرانی کی جگہ انسانوں کی حکومتیں قائم ہوگئیں تو دین اور سیاست میں ثنویّت پیدا ہوگئی۔ ۔ ۔ امورِ مملکت، ایوانات حکومت میں طے ہونے لگے اور مسجدیں اور کعبہ پرستش گاہیں بن کر رہ گئے۔ اور اس تفریق نے اس قدر شدّت اختیار کی کہ مسجدوں میں (جن میں مسجد الحرام یعنی خانہ کعبہ بھی شامل تھا) دنیاوی باتیں کرنا ناجائز قرار دے دیا گیا۔ جو حضرات سنہ ۱۳-۱۹۱۲ء میں ہندوستان میں موجود تھے انہیں وہ بحثیں اب تک یاد ہونگی جو اس وقت بڑی شدّت سے اٹھی تھیں (اور جن کا نمایاں ترین ذریعہ ابلاغ، مرحوم (مولانا) ابوالکلام آزاد کا اخبار الہلال تھا۔) بحثیں یہ تھیں کہ مساجد میں سیاسی تقریریں ہوسکتی ہیں یا نہیں؟ مساجد کے سلسلہ میں تو یہ بحث چھڑی تھی لیکن کعبہ کے ضمن میں اس موضوع پر ایک لفظ تک کہیں سے سُننے میں نہیں آیا۔ وہ خالصتہً پرستش کا مقام تصوّر کیا جاتا تھا۔

تیرہ سو سال کے بعد یہ منظر پہلی بار (مجھے) دیکھنے میں آیا کہ سربراہانِ مملکت، حریمِ کعبہ میں سیاسی امور پر مصروفِ گفت و شنید ہیں۔ ہرچند یہ اجتماع معنوی اعتبار سے نہ تو ان اجتماعات جیسا خوش آئند تھا جو اسلام کے صدرِ اوّل میں حریمِ کعبہ میں منعقد ہوا کرتے تھے، نہ ہی ان جیسا جو اس زمانے میں منعقد ہوا کریں گے جب دنیا میں اسلامی نظام نافذ ہوگا ——— اس لئے کہ یہ اجتماع "مسلمانوں" کی مملکتوں کے نمائندگان کا تھا۔ اسلامی مملکت کے نمائندگان کا نہیں تھا۔ اسلامی مملکت تو اس وقت دنیا میں کہیں بھی نہیں۔ اسلامی اور غیر اسلامی کا معیار تو قرآن مجید نے چار لفظوں میں واضح کر دیا ہے جب کہا ہے کہ

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)

جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے، وہ کافر ہیں۔

اور کتاب اللہ کے مطابق حکومت اس وقت کہیں بھی قائم نہیں۔ لیکن بایں ہمہ، حریمِ کعبہ میں اس سیاسی اجتماع سے ایک بُت تو ٹوٹا، ایک طرح تو پڑی۔ اور ہمارے لئے اتنی بات بھی بہرحال خوش آئند ہے۔ ہم تو ان میں سے ہیں جن کے متعلق غالبؔ نے کہا تھا کہ ؎

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے   حورانِ خُلد میں تیری صورت اگر ملے

اجتماع کا مقصد نہ سہی۔ اس کی صورت تو نظر آئی۔ اس دور میں اتنا ہی غنیمت ہے۔ شاید یہ منزل تک پہنچنے کی پہلی کڑی بن جائے۔

——— (۲) ———

یہ تیسری کانفرنس منعقد ہوئی ہے۔ اس کے نتائج کے متعلق کچھ کہنا قبل از وقت سمجھا جائے گا، لیکن سابقہ دو کانفرنسوں کے نتائج تو تاریخی شواہد ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان کانفرنسوں سے قوم کی پہلے کی اور بعد کی حالت میں کچھ فرق پڑا؟ ہمیں تو یہی نظر آیا کہ حالات پہلے سے بھی زیادہ ابتر ہوگئے۔ اور خود اس کانفرنس میں اس کا اعتراف کیا گیا۔ کچھ ممالک میں ... ریگستانوں (ذیلی) کے چشموں کا اُبل آنا اور ان کی وجہ سے دولت میں فراوانی ہوجانا تو حالات کا سنورنا نہیں کہلا سکتا۔ حالت یہ ہے کہ تمام مسلم ممالک، غیر مسلم سپرپاورز کے تصوّر تک سے ہر وقت لرزاں و ترساں رہتے ہیں۔ کانفرنسیں منعقد ہوتی ہیں۔ ان میں مملکتوں کے نمائندگان بیٹھتے ہیں ——— اپنی زبوں حالی کے اسباب اور وجوہات پر غور و خوض کرتے ہیں۔ ان کے ازالہ اور مداوا کی تجاویز سوچتے ہیں۔ لیکن اس

کے باوجود کیفیت یہی رہتی ہے کہ ؎

نہ دُکھ جائے نہ درماں راس آئے مگر خبطِ دوا ہے اور میں ہوں

سوال یہ ہے کہ پھر اصل خرابی کہاں ہے جس کی وجہ سے، اس قدر کد و کاوش کے باوجود، حالت ذرا نہیں سنورتی ..... اس اصل خرابی کا معلوم کر لینا چنداں دشوار نہیں۔ یہ کانفرنسیں "اسلامی سربراہی کانفرنسیں" کہلاتی ہیں۔ یعنی یہ اسلام کے حوالے سے منعقد ہوتی ہیں۔ ان میں شرکت کرنے والے مسلمانوں کی حیثیت ہی سے شریک ہوتے ہیں۔ قرآنِ کریم میں "مسلمان" کی جگہ مومن کا لفظ آیا ہے۔ اس میں واضح الفاظ میں کہا گیا ہے کہ

وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ۝ (۴/۱۴۱)

یہ ہو نہیں سکتا کہ خدا مومنوں پر کافروں کو غلبہ عطا کر دے۔

ان کانفرنسوں میں بیٹھ کر سوچنے کی صرف اتنی بات ہے کہ

(۱) خدا نے حتمی طور پر کہا ہے کہ یہ ناممکن ہے کہ غیر مسلم، مومنین پر غلبہ حاصل کر لیں۔

(۲) آج یہ واقعہ ہے کہ غیر مسلموں کو دنیا بھر کے مسلمانوں پر غلبہ و تسلط حاصل ہے۔ خواہ وہ کسی شکل میں ہو۔

(۳) اس کے بعد دو ہی باتیں رہ جاتی ہیں۔ یعنی (ا) یا تو خدا کا یہ دعویٰ (معاذ اللہ) غلط ہے کہ مومنوں پر غیر مسلموں کا غلبہ نہیں ہو سکتا۔ اور (ب) یا ہم مومن نہیں۔

(۴) خدا کا دعویٰ تو غلط ہو نہیں سکتا۔ لہٰذا

(۵) یہ ظاہر ہے کہ ہم مومن نہیں۔

اس کے بعد کرنے کا کام یہ رہ جاتا ہے کہ ہم متعین کریں کہ قرآن کریم، مومنین کی خصوصیات، صفات، علامات کیا بتاتا ہے۔ اور ہم ویسا بننے کی کوشش کریں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس خوش فہمی سے نکل جائیں کہ انسان محض نماز روزے کی ادائیگی سے مومن بن جاتا ہے۔ مومن بننے کے لئے معاشرہ یا مملکت کا نظام بدلنا پڑتا ہے۔

اور اگر ہم ایسا نہیں کرنا چاہتے تو پھر ہمیں اسلام کے حوالے سے اپنی حالت سدھارنے کے خیال کو ترک کر دینا چاہیئے، اور جس طرح دنیا کی باقی قومیں اپنی فلاح و بہبود کے لئے سوچتی اور کرتی ہیں، اسی طرح ہمیں کرنا چاہیئے۔ اس سے اگر ہم "دین" کی سعادات و برکات سے محروم رہ جائیں گے تو کم از کم دنیا کے مفادات تو حاصل کر سکیں گے۔ اس وقت تو ہماری حالت یہ ہے کہ

بیکسیہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں!

اور یہ اس لئے کہ دل میں ہمارے اسلام ہوتا نہیں اور زبان سے ہم کھلے بندوں کفر کا اقرار بھی نہیں کرتے۔ (مثلاً) کیا یہ واقعہ نہیں کہ اس "اسلامی سربراہی کانفرنس" میں جس کا مقصدِ اولیں اتحادِ بین المسلمین تھا، وہ لوگ بھی بیٹھے تھے جو ایک ہی ماہ پہلے، اردن کے دارالحکومت عمان میں منعقد شدہ "عرب سربراہی کانفرنس"

میں یہ ریزولیوشن پاس کر کے آئے تھے کہ

> کسی عرب ملک اور غیر عرب ملک میں جنگ ہوگی تو کوئی بھی عرب ملک، غیر عرب ملک کی حمایت نہیں کرے گا۔
>
> (طلوعِ اسلام۔ بابت جنوری ۱۹۸۱ء)

اس "اسلامی سربراہی کانفرنس" میں، عرب ممالک کے نمائندے بھی شامل تھے، اور غیر عرب ممالک، کے نمائندے بھی۔ اور ان سب کو معلوم تھا کہ عرب اور عجم کی یہ تفریق اسلام کی جڑ کاٹ دیتی ہے۔ سوچئے کہ اس کانفرنس میں، اتحاد بین المسلمین کے ریزولیوشن کچھ بھی حقیقت رکھیں گے؟ کیا یہ اجتماع ایسا ہی نہیں تھا جس کے متعلق قرآنِ مجید نے کہا تھا کہ

تَحۡسَبُهُمۡ جَمِيعٗا وَقُلُوبُهُمۡ شَتَّىٰ (۵۹/۱۴)

تم انہیں یکجا بیٹھے دیکھ کر خیال کرتے ہو کہ سب اکٹھے ہیں؛ بالکل نہیں۔ ان کے صرف جسم یکجا ہیں۔ دل ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں۔

کیا اس قسم کی جمعیت کو "اسلامی" کہا جا سکتا ہے؟ کوئی جمعیت محض ریزولیوشنوں اور ٹیکنیکیشنوں سے اسلامی نہیں ہو سکتی۔ نہ ہی آئین میں اس قسم کی شقیں رکھنے سے کوئی مملکت اسلامی ہو سکتی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے جیسے مسلمانوں سے قرآن کیا مطالبہ کرتا ہے؟ وہ ہم سے مطالبہ کرتا ہے از سرِ نو مسلمان ہونے کا، یعنی ایمان لانے کا۔ ارشادِ خداوندی ہے:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي نَزَّلَ عَلَىٰ رَسُولِهِ ۔۔۔ (۴/۱۳۶)

اے وہ جو اپنے آپ کو مومن (مسلمان) کہتے ہو، تم ایمان لاؤ اللہ پر۔ اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جسے اس نے اپنے رسول پر نازل کیا ہے۔

آج یہ مطالبہ ساری دنیا کے مسلمانوں سے ہے۔ لہٰذا، ہمیں اپنی کانفرنسوں کو "اسلامی" کہنے کا حق اس وقت حاصل ہوگا جب ہم قرآن پر ایمان لائیں گے۔ اور قرآن پر ایمان لانے سے مطلب یہ ہے کہ ہماری مملکتوں میں قرآن کی حکمرانی ہوگی۔ اس ایمان کے بغیر، اپنے آپ کو مومن تصور کر لینا اور اس "ہجومِ مومنین" کو حریمِ کعبہ میں لے کر بیٹھ جانے کو "اسلامی اجتماع" قرار دینا، خود فریبی سے زیادہ کچھ نہیں۔ اقبالؒ نے اسی قسم کے مسلمانوں کے متعلق کہا تھا کہ ؎

متاعِ شیخ اساطیرِ کہن بود   حدیثِ او ہمہ تخمین و ظن بود
ہنوز اسلامِ او زنار دار است   حرم چوں دیر بود، او برہمن بود

(ارمغانِ حجاز صفحہ ۴۹)

——— (۰) ———

جیسا کہ ہم نے شروع میں کہا ہے، اسلام کا نصب العین اور منتہیٰ، تمام نوعِ انسان کو ایک عالمگیر اُمت بنانا ہے۔ اس کے نزدیک اسی سے فسادِ آدمیت مٹ سکتا ہے۔ یہ دین کا پیغام تھا۔ اس کے برعکس، انسانی عقل نے اجتماعیت کا جو نقشہ تجویز کیا اس کی آخری شکل قومیت (نیشنلزم) ہے۔ لیکن انسان اس نقشہ کو لے کر چار قدم بھی نہیں چلا تھا کہ اس کی تباہ کاریوں کے ہاتھوں چیخ اٹھا اور اب وہ اس کی جگہ اجتماعی نظام کی کسی اور شکل کی تلاش میں سرگرداں

ہے۔ اقوامِ مغرب، قومیت کی سب سے زیادہ مدح خواں تھیں اور اب انہی اقوام کے دانشور اس کے سب سے زیادہ مخالف ہیں۔ اس موضوع پر طلوعِ اسلام میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس مقام پر ہم دو ایک مثالوں پر اکتفا کریں گے۔

لندن یونیورسٹی کا پروفیسر، الفریڈ کوبن، اپنی کتاب (THE CRISIS OF CIVILISATION) میں لکھتا ہے:۔

> قومیت پرستی کا احساس نفرت سے پیدا ہوتا ہے اور عداوت پر پرورش پاتا ہے۔ ایک قوم کو اپنی ہستی کا احساس ہی اس وقت ہوتا ہے جب وہ کسی دوسری قوم سے متصادم ہو۔ پھر ان اقوام کا جذبۂ عداوت و پیکار اپنی قومی وحدت کی تکمیل پر ہی ختم نہیں ہو جاتا۔ جونہی کوئی قوم اپنے حقِ خود مختاری کو مستحکم کر لیتی ہے، تو ان اقوام کو دبانا شروع کر دیتی ہے جو اپنے لئے حقِ خود مختاری مانگتی ہوں۔ (صفحہ ۱۶۶)

برٹرینڈ رسل اپنی کتاب (THE HOPES FOR A CHANGING WORLD) میں لکھتا ہے:۔

> ہمارے زمانے میں جو چیز معاشرتی روابط کو قومی حدود سے آگے بڑھانے میں مانع ہے، وہ نیشنلزم ہے۔ اس لئے نیشنلزم، نوعِ انسان کی تباہی کے لئے سب سے بڑی قوت ہے۔ پھر تماشہ یہ ہے کہ ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ دوسرے ملکوں کی نیشنلزم بڑی خراب چیز ہے لیکن اس کے اپنے وطن کی نیشنلزم بہت اچھی ہے۔

ہمارے زمانے میں نیشنلزم کی حیثیت ایک سیاسی نظریہ ہی کی نہیں رہی۔ اس نے ایک مذہبی عقیدہ کی شکل اختیار کر لی ہے۔ آلڈس ہکسلے کے الفاظ میں:۔

> نیشنلزم ایک بت پرستانہ اور مشرکانہ مذہب کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ ایسا مذہب جو فساد اور تفریقِ انسانیت کے لئے ایسا طاقتور ہے کہ کوئی توحید پرست مذہب فلاح اور وحدتِ انسانیت کے لئے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ نیشنلزم یا نسل پرستی کا جذبہ بالکل پاگلوں کا مسلک ہے۔
>
> (THE PERENNIAL PHILOSOPHY)

نیشنلزم کی تباہ کاریوں کے مداوا کے لئے انہوں نے انٹرنیشنلزم کا مسلک اختیار کیا۔ پہلے لیگ آف نیشنز اور اس کے بعد اقوامِ متحدہ کا ادارہ قائم کیا۔ لیکن یہ تدبیر کس طرح ناکام رہی اس کے متعلق (EMERY REVES) اپنی کتاب (THE ANATOMY OF PEACE) میں لکھتا ہے:۔

> ہم انٹرنیشنلزم سے کافی کھیل چکے ہیں۔ جو مسئلہ دنیا کے سامنے ہے وہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں جو قوموں کے حل کرنے کا ہو (وہ تو خود قوموں کا پیدا کردہ ہے) وہ مسئلہ یہ ہے کہ نیشنلزم کے نظریہ نے انسانی معاشرہ میں ایک فساد برپا کر دیا ہے۔ لہٰذا کیسے ممکن ہے کہ خود نیشنلزم خواہ وہ انٹرنیشنلزم ہی کیوں نہ بن جائے، اس کا حل دریافت کر دے۔ (صفحہ ۱۶۴۔ بحوالہ "انسان نے کیا سوچا"۔ صفحہ ۲۴۷)

ان تجربات کی ناکامیوں کے بعد، انسانی فکر کس نتیجہ پر پہنچا ہے اور وہ انسانیت کے اس بنیادی مسئلہ کا حل کیا سمجھتا ہے؟ وہی حل جس کا قرآن نے چودہ سو سال پہلے اعلان کیا تھا۔ (REVES) اپنے مندرجہ بالا اقتباس کے تسلسل میں لکھتا ہے:-

اس مسئلہ کا حل انسانی عالم گیریت میں ہے۔ ایک ایسا عقیدہ یا تحریک جس کا مقصد یہ ہو کہ وہ قومیت اور بین الاقوامیت کی سطح سے اوپر جا کر، خالص انسانی سطح پر، دنیا میں امن قائم کرنا چاہتی ہے۔

یہ آواز اب اقوامِ مغرب کے مختلف گوشوں سے ابھرنی شروع ہو گئی ہے۔ (TEIL HARD-DE CHARDIN) اپنی کتاب (BUILDING THE EARTH) میں لکھتا ہے:-

اب اقوام کا زمانہ گزر چکا ہے۔ اگر ہم نے ہلاکت سے بچنا ہے تو کرنے کا کام صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ ہم اپنے قدیم تعصبات کو ختم کریں اور (مختلف ملکوں اور خطوں کی حدود سے آگے بڑھ کر) خود کرۂ ارض کی تعمیرِ نو کا انتظام کریں۔ انسان کو اس کی موجودہ پستی سے اچھال کر بلندیوں کی طرف لے جانے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے وحدتِ انسانیت کا راستہ۔ اب شعورِ انسانی کے لئے ضروری ہے کہ وہ خاندان، وطن اور نسل کی تنگ ناؤں سے آگے بڑھ کر پوری نوعِ انسان کو اپنے آغوش میں لے لے۔

اور سویڈن کا مشہور ماہر اقتصادیات (GUNNER MYRDAL) کہتا ہے کہ

یہ حقیقت ہے کہ ہمارے یہ بلند مقاصد اسی صورت میں حاصل ہو سکیں گے جب ایک ایسی دنیا وجود میں آجائے جس میں نہ کرۂ ارض کے نقشے پر کھینچی ہوئی ممالک کی لکیریں ہوں، اور نہ ہی قوموں کے خود وضع کردہ حدود۔ یہ وہ دنیا ہوگی جہاں انسان جہاں چاہے آزادانہ چلے پھرے، رہے سہے، اور ہر جگہ یکساں شرائط پر اپنے لئے حصولِ مسرت کر سکے۔ سیاسی طور پر اس سے مراد تمام دنیا کی واحد حکومت ہوگی۔ اور جمہوری طور پر یہ تمام انسانوں کے باہمی مشورہ سے اپنا کاروبار سرانجام دے گی۔ ہم اپنی روح کے مذہبی نشیمن میں کسی اسی قسم کی حسین دنیا کا تصور محسوس کرتے ہیں جس میں کامل ہم آہنگی اور یکجہتی ہو۔

جس حسین دنیا کا تصور یہ دانشور اپنی روح کے مذہبی نشیمن میں محسوس کرتے ہیں، اس کا مکمل نقشہ اور اس کے حصول کا طریقہ قرآن مجید کے اوراق میں چمکتا ہوا موجود ہے۔ دنیا کو اس کتابِ عظیم کے وارثوں (اُمتِ مسلمہ) سے توقع تھی کہ وہ مغربی قومیت پرستی کی تنگ ناؤں سے نکل کر، عالم گیر انسانی برادری کو عملاً قائم کر کے دکھائیں گے۔

آرنلڈ ٹوئن بی، ہمارے زمانہ میں تاریخِ تہذیب کا بہت بڑا محقق ہے۔ وہ اپنی کتاب (THE WORLD AND THE WEST) میں لکھتا ہے:-

مغرب میں بعض دوسرے تصورات بھی ہیں جن کا باعثِ فوز و فلاح ہونا بے حد مشکوک ہے۔ ان میں سے ایک ہمارا نیشنلزم ہے۔ ترک اور بعض دیگر اسلامی ممالک نیشنلزم کے تصور سے بھی اسی طرح متاثر ہو رہے ہیں جس طرح اور مغربی تصورات سے۔ ہمیں اپنے آپ سے پوچھنا چاہیئے کہ جن مسلمانوں کا مذہبی عقیدہ یہ ہے کہ تمام دنیا کے مسلمان، بلا لحاظِ اختلاف، نسل، رنگ،

زبان، عادات وغیرہ محض مسلمان ہونے کی حیثیت سے بھائی بھائی ہیں۔ ان میں بھی اگر نیشنلزم کا ایسا تنگ نظر عقیدہ رائج ہو گیا تو دُنیا کا حشر کیا ہو گا؟ آج جبکہ مغربی صنعت کاری کی وجہ سے دنیا میں "فاصلہ" کا تصور آہستہ آہستہ مٹتا جا رہا ہے ..... مسلمانوں کا اخوتِ باہمی کا عقیدہ یقیناً مغرب کی تنگ نظر قومیت پرستی کے عقیدہ سے کہیں بہتر ہے اور یہی عقیدہ موجودہ زمانہ کے تقاضوں کو پورا کر سکتا ہے۔ برعکس مغربی عقیدہ کے جس نے یورپ میں، محض قومیت کے معیار پر، درجنوں آزاد مملکتوں کو پیدا کر رکھا ہے جن میں سے ہر ایک، دوسری سے الگ ہے۔ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد یورپ کی جو حالت ہو چکی ہے، اس میں یورپ کے اندر کم و بیش چالیس آزاد مملکتوں کا وجود ایک ایسا بڑا خطرہ ہے جس کا کوئی علاج ہی نہیں ہو سکتا۔ (خود یورپ کی تباہی کا تو یہ عالم ہے لیکن) یورپ کی تہذیب نے لوگوں کی آنکھوں کو ایسا چندھیا دیا کہ وہ اس کے تصوراتِ حیات کو آنکھیں بند کئے اپنائے چلے جا رہے ہیں۔ ہمیں کم از کم مسلمانوں سے تو یہ توقع رکھنی چاہیئے کہ وہ اپنے عالمگیر مودّت و اخوّت کے تصور کو چھوڑ کر یورپ کا ایسا تنگ نظری کا تصور اپنے ہاں رائج نہیں کریں گے۔ ایک عالمگیر برادری کا تصور ویسے تو فلاحِ انسانی کے لئے ہمیشہ ضروری رہا ہے، لیکن اس ایٹم کے دور میں اس کی اہمیت اور ضرورت اور بھی شدید ہو گئی ہے۔

دنیا ہماری طرف نگاہیں لگائے بیٹھی ہے اور ہم حریم کعبہ میں منعقد ہونے والی "اسلامی کانفرنس" کی طرف نگاہیں لگائے بیٹھے تھے کہ وہ، اپنی اپنی قومیتوں کے امتیازات کو ختم کر کے، وحدتِ اُمت اور اس کی بنا پر وحدتِ حکومت کے نصب العین کا اعلان کرے گی تاکہ وہ وحدتِ آدم کے قرآنی منتہیٰ تک پہنچنے کے لئے آغازِ کار کا کام دے۔

کانفرنس کی طرف سے شائع کردہ مکہ ڈیکلریشن (اعلامیہ) میں (جس کا بڑا شہرہ ہے) کہا گیا ہے:۔

تمام مسلمان۔ زبان، رنگ، وطن، یا دیگر کوائف کے اختلاف کے باوجود، ایک نیشن ہیں جو ایمان کے اشتراک کی بنا پر باہم وابستہ ہیں۔ ان کی ایک ہی منزل ہے جس کی طرف یہ اس کلچر کی کشش سے جسے انہوں نے ورثہ میں پایا ہے اور اس مقصد کی رُو سے جو ان میں مشترک ہے، دنیا میں آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اس طرح یہ ایک اُمتِ وسطیٰ (NATION OF ... MOUERATION) کی طرح کھڑے ہیں۔

وحدتِ اُمت کے اس تصور کے بعد یہاں تک بھی کہا گیا ہے کہ

ہم دیگر مملکتوں اور قوموں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ، اخوتِ انسانیہ کے مخلص جذبہ کے تحت، اس کانفرنس کے ان (مقدس) جذبات سے ہم آہنگ ہوں تاکہ ہم ہر قسم کی نفرت، ناانصافی، ظلم و استبداد کو ختم کر کے اس کرۂ ارض کی ایسی تعمیرِ نو کریں کہ یہ (عالمگیر) انسانیت کی رہائش کے قابل ہو جائے۔

یہ مقاصد بڑے بلند اور یہ آرزوئیں عین مطابقِ اسلام ہیں۔ لیکن یہ اعلامیہ میں بیان کردہ دیگر کئی ایک پرکشش مقاصد کی طرح، محض الفاظ تک محدود ہیں۔ انہیں عمل میں لانے کی کوئی تجویز یا پروگرام پیش نہیں کیا گیا۔ مسلمانوں کی کوئی سی کانفرنس یا تقاریب ہیں جن میں اس قسم کے بلند و بالا دعاوی نہیں کئے جاتے۔ سوال تو یہ ہے کہ آغازِ کار کے لئے ہی سہی، ان مقاصد کے حصول کے لئے عملی پروگرام کیا تجویز کیا جاتا ہے؟

اعلامیہ میں (لفظاً ہی سہی) جملہ اختلافات کو مٹا کر، امّتِ واحدہ کا تصوّر دیا گیا ہے لیکن صدرِ پاکستان جنرل ضیاء الحق نے عالمِ اسلام کو "جمعیت الاقوام" قرار دیا ہے۔ یعنی جس مقام کو غیر مسلم مفکر ناقابلِ اطمینان قرار دے کر وحدتِ آدم کی طرف بڑھ رہے ہیں، ہم اسے اسلام کا منتہیٰ قرار دے رہے ہیں! صدرِ پاکستان نے ایسا اقبالؒ کے حوالے سے کہا ہے۔ انہوں نے اپنی تقریر میں فرمایا:۔

مجھے اس باب میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ اُمّتِ مسلمہ کے مستقبل کے متعلق جو خواب ہم دیکھ رہے ہیں، پندرھویں صدی اس کی تعبیر کی آئینہ دار ہوگی۔ یہ صدی امّتِ مسلمہ کی تقدیر کے متعلق، عصرِ حاضر کی مسلمان حکومتوں سے جو مطالبہ کرتی ہے، وہ واضح ہے۔ علّامہ اقبالؒ نے اپنے "خطباتِ تشکیلِ جدید" میں، ۱۹۲۹ء میں کہا تھا۔

"سرِ دست ہر مسلم قوم کو چاہیئے کہ وہ اپنی ذات میں ڈوب جائے۔ انہیں چاہیئے کہ عارضی طور پر اپنی تمام توجہ اپنے آپ پر مرتکز کر دیں تاکہ یہ سب، اتنی طاقتور ہو جائیں کہ باہم مل کر، اسلامی جمہوریتوں کی ایک جاندار برادری کی شکل اختیار کر لیں۔ نیشنلسٹ مفکر ضیاء کہتے ہیں کہ (عالمِ اسلامی کا) ایک حقیقی اور مؤثر اتحاد ایسا آسان نہیں کہ محض ایک خلیفہ کے نمائشی تقرر سے وجود میں آجائے۔ اس کا ظہور ہوگا تو آزاد اور خود مختار وحدتوں کی ایک ایسی کثرت میں ہوگا جن کی نسلی رقابتوں کو ایک روحانی نصب العین نے توافق و تطابق سے بدل دیا ہو۔ میں تو کچھ ایسا دیکھ رہا ہوں کہ مشیّتِ ایزدی ہم مسلمانوں کو بتدریج سمجھا رہی ہے کہ اسلام نہ تو نیشنلزم ہے ——— نہ شاہنشاہیت۔ بلکہ ایک انجمنِ اقوام جس نے ہمارے خود ساختہ حدود اور نسلی امتیازات کو تسلیم کیا ہے تو محض سہولتِ تعارف کی خاطر، نہ اس لئے کہ اس کے ارکان اپنا اجتماعی مطمحِ نظر محدود کر لیں۔

(تشکیلِ جدید۔ (انگریزی ص۱۵۹)"

(اس کے بعد صدرِ پاکستان نے کہا) آئیے ہم اس عظیم نصب العین کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیں۔ مجھے اس میں قطعاً شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رحمتِ بے پایاں ہماری کوششوں کو کامیاب کریگی اور امّتِ مسلمہ کو اس قابل بنا دیگی کہ وہ یقینِ محکم کے ساتھ آگے بڑھتی چلی جائے۔ (بحوالہ دی مسلم۔ ۲۷ جنوری ۱۹۸۱ء)

۱؎ علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبہ میں (FAMILY OF REPUBLICS) یعنی "اسلامی جمہوریتوں کی برادری" کہا تھا۔ صدرِ پاکستان نے اسے (FAMILY OF GOVERNMENTS) سے بدل دیا۔ شخصی حکومتوں کے نمائندگان کی موجودگی میں قرینِ مصلحت یہی تھا کہ "جمہوریتیں" نہ کہا جائے لیکن اسے اقبالؒ کی طرف منسوب نہیں کرنا چاہیئے تھا۔

اس سے (بظاہر) یہ مترشح ہوتا ہے کہ اقبالؒ اسلام کا منتہیٰ جمعیتِ اقوام قرار دیتا ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ انہوں نے جس سیاق و سباق (CONTEXT) میں یہ کہا تھا اسے، اس کے اندر رکھ کر دیکھا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ انہوں نے، اسے اسلام کا منتہیٰ نہیں قرار دیا تھا، بلکہ کہا یہ تھا کہ سب سے پہلے کرنے کا کام یہ ہے کہ مسلمانوں کی مختلف مملکتیں (جو اُس زمانے میں بے حد کمزور ہو چکی تھیں) اپنی اپنی جگہ اپنے اندر قوت پیدا کریں اور پھر ایسا باہمی اتحاد پیدا کریں کہ اپنی متحدہ قوت کی بنا پر ان مغربی قوتوں کی یورشوں اور سازشوں کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو سکیں جو انہیں نیست و نابود کرنے پر تلے بیٹھی تھیں۔ یہ تاثر دینا کہ اقبالؒ، مسلمانوں کی مختلف قومیتوں کا قائل تھا، اس کے عمر بھر کے جہاد کو ملیا میٹ کر دینے کے مرادف ہے۔ اقبالؒ، وطنی۔ جغرافیائی۔ نسلی۔ قومیتوں کا کس قدر دشمن تھا اور اسے کس طرح اسلام کی اصل و اساس کے خلاف قرار دیتا تھا اس کے متعلق اس مقام پر تفصیل سے لکھنے کی ضرورت نہیں۔ اس کے لئے زیادہ نہیں تو اس مقالہ کو ایک نظر پھر دیکھ لیا جائے جو "دو قومی نظریہ" کے عنوان سے طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت جنوری ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا تھا۔

اقبالؒ، وحدتِ اُمّت کے اسلامی تصور کا پیامبر تھا جس کا لازمی نتیجہ وحدتِ حکومت ہے۔ اور یہ بھی مقصود بالذّات نہیں بلکہ وحدتِ آدم کے عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ انہوں نے، مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کے ساتھ اپنی بحث کے سلسلہ میں لکھا تھا:۔

> مجھے یورپین مصنفوں کی تحریروں سے ابتداء ہی سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی تھی کہ یورپ کی ملوکانہ اغراض اس امر کی متقاضی ہیں کہ اسلام کی وحدتِ دینی کو پارہ پارہ کرنے کے لئے اس سے بہتر اور کوئی حربہ نہیں کہ اسلامی ممالک میں "افرنگی نظریۂ وطنیت" کی اشاعت کی جائے۔ چنانچہ ان لوگوں کی یہ تدبیر جنگِ عظیم میں کامیاب بھی ہو گئی۔

انہوں نے پروفیسر نکلسن کے نام اپنے خط میں تحریر فرمایا تھا:۔

> اسلام ہمیشہ رنگ و نسل کے عقیدے کا، جو انسانیت کے نصب العین کی راہ میں سب سے بڑا سنگِ گراں ہے، نہایت کامیاب حریف رہا ہے۔ (یہاں) کا یہ خیال غلط ہے کہ سائنس اسلام کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ دراصل، اسلام بلکہ کائناتِ انسانیت کا سب سے بڑا دشمن رنگ و نسل کا عقیدہ ہے اور جو لوگ نوعِ انسان سے محبت رکھتے ہیں، ان کا فرض ہے کہ ابلیس کی اس اختراع کے خلاف علمِ جہاد بلند کریں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ قومیت کا عقیدہ جس کی بنیاد نسل یا جغرافیائی حدود و ملک پر ہے، دنیائے اسلام میں استیلا حاصل کر رہا ہے اور مسلمان، عالمگیر اخوت کے نصب العین کو نظر انداز کر کے اس عقیدہ کے فریب میں مبتلا ہو رہے ہیں جو قومیت کو ملک و وطن کی حدود میں مقید رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس لئے میں ایک مسلمان اور ہمدردِ نوعِ انسان کی حیثیت سے انہیں یہ یاد دلانا مناسب سمجھتا ہوں کہ ان کا حقیقی فریضہ سارے بنی آدم کی نشوونما ہے۔

وہ وحید احمد صاحب (مدیر "نقیب" بدایوں) کے نام، ۷ ستمبر ۱۹۲۱ء کو ایک مکتوب میں پہلے یہ قطعہ لکھتے ہیں:-

تو اے کودک منش خود را ادب کن
مسلمان زادۂ، ترکِ نسب کن
برنگِ احمر دخون و رگ و پوست
عرب نازد اگر، ترکِ عرب کن

اور اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں:-

اس زمانے میں سب سے زیادہ بڑا دشمنِ اسلام اور اسلامیوں کا نسلی امتیاز اور ملکی قومیت کا خیال ہے۔ پندرہ برس ہوئے جب میں نے پہلے پہل اس کا احساس کیا۔ اس وقت میں یورپ میں تھا اور اس احساس نے میرے خیالات میں انقلابِ عظیم پیدا کر دیا..... اس کے بعد آج تک یہی خیال میرا مطمعِ نظر رہا ہے۔ (بحوالہ۔ انوارِ اقبالؒ۔ ص ۱۷۶)

وہ سید سعید الدین جعفری کے نام (۱۹۲۳ء میں) ایک مکتوب میں رقمطراز ہیں:-

میرے نزدیک اسلام نوعِ انسان کی اقوام کو جغرافیائی حدود سے بالاتر کرنے اور نسل و قومیت کے مصنوعی معیار انتقاءِ انسانی کے ابتدائی مراحل میں مفید امتیازات کو مٹانے کا ایک عملی ذریعہ ہے۔ (خطوطِ اقبالؒ۔ رفیع الدین ہاشمی۔ ص ۱۶۵)

وہ "مسلمان" کے سوا کوئی اور نام تک رکھنا بھی جائز نہیں سمجھتے تھے۔ انہوں نے ۲ مئی ۱۹۳۱ء کو لاہور میں ایک جلسۂ عام سے خطاب کے دوران کہا تھا:-

رسولِ عربی (صلعم) کا وہ حکم موجود ہے جس میں فرمایا گیا تھا کہ آج میں نسل، ذات پات، اور برادری کے تمام امتیازات کو پاؤں کے نیچے کچلتا ہوں۔ تم سب مسلمان ہو اور یہی تمہارا صحیح نام ہے۔ (گفتارِ اقبالؒ۔ از محمد رفیق افضل۔ ص ۱۱۷)

موجودہ (عیسوی) صدی کے ابتدائی ادوار میں "پین اسلامزم" کی اصطلاح بڑی عام ہوئی تھی۔ اس سے مراد یہ لیا جاتا تھا کہ مسلمانوں کی مختلف مملکتیں اپنی اپنی قومیتوں کو برقرار رکھتے ہوئے، باہمی اتحاد کا معاہدہ کریں۔ علامہ اقبالؒ نے اس کی مخالفت کی، اور اگست ۱۹۳۳ء میں، بمبئی کرانیکل (BOMBAY CHRONICLE) کے نمائندے کو انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا:-

میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ پین ازم سے اسلام کی عالمگیر سلطنت بہت مختلف ہے اسلام ایک عالمگیر سلطنت کا یقیناً منتظر ہے جو نسلی امتیازات سے بالاتر ہوگی اور جس میں شخصی اور مطلق العنان بادشاہتوں اور سرمایہ داریوں کی گنجائش نہ ہوگی۔ دنیا کا تجربہ خود ایسی سلطنت پیدا کر دے گا۔ غیر مسلموں کی نگاہ میں شاید یہ محض خواب ہو لیکن مسلمانوں کا یہ ایمان ہے۔
(گفتارِ اقبالؒ۔ ص ۱۷۸)

آپ نے غور فرمایا کہ اقبالؒ مسلمانوں کی واحد عالمگیر سلطنت کو اسلام کا تقاضا سمجھتے تھے، نہ کہ مختلف مملکتوں

کے وجود کو علیٰ حالہٖ قائم رکھتے ہوئے، ان کی متحدہ اقوام کے نقشہ کی جمعیت کو اسی سلسلہ میں ایک نظر ان کے چند ایک اشعار پر بھی ڈال لیجئے۔ انہوں نے سنہ ۱۹۲۱ء میں اپنی مشہور نظم 'خضرِ راہ' میں کہا تھا:۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے — نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر
جو کرے گا امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائیگا — تُرکِ خرگاہی ہو یا اعرابیِ والا گہر!
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی — اُڑ گیا دنیا سے تو مانندِ خاکِ رہگذر

اور اس سے اگلے سال، (اپنی نظم طلوعِ اسلام) میں فرمایا تھا:۔

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو — اخوّت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا!
یہ ہندی، وہ خراسانی، یہ افغانی، وہ تورانی! — تو اے شرمندۂ ساحل! اچھل کر بیکراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے — تو اے مرغِ حرم! اُڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

اور پھر بالِ جبریل میں:۔

رہے گا راوی و نیل و فرات میں کب تک — ترا سفینہ کہ ہے بحرِ بیکراں کے لئے

اور جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے ان کے نزدیک وحدتِ اُمّت سے بھی مقصود وحدتِ آدم کے لئے زمین ہموار کرنا ہے۔ انہوں نے یکم جنوری سنہ ۱۹۳۸ء کو، سالِ نو کے پیغام کو ریڈیو لاہور سے براڈکاسٹ کرتے ہوئے کہا تھا:۔

وحدت ایک ہی قابلِ اعتماد ہے اور وہ ہے وحدتِ آدم۔ جب تک یہ نام نہاد ڈیماکریسی، یہ ملعون نیشنلزم اور یہ ذلیل ترین شاہنشاہیت (ملوکیت) پاش پاش نہیں ہوتے، جب تک انسان اپنے عمل سے یہ ثابت نہیں کرتا کہ "مخلوق ساری ہے کنبہ خدا کا"، جب تک نسل، رنگ اور جغرافیائی قومیتوں کا نام و نشان تک نہیں مٹا دیا جاتا، نوعِ انسان کبھی مسرت اور طمانیت کی زندگی بسر نہیں کر سکے گی۔ نہ ہی آزادی، مساوات اور اخوت کے حسین تصورات شرمندۂ معنی ہو سکیں گے۔

انہوں نے اپنے ایک بیان میں (جو انقلاب بابت ۱۹ جنوری سنہ ۱۹۲۹ء میں چھپا تھا) فرمایا تھا:۔

اسلام اس تجربہ کا نام ہے جو قوم، نسل اور ملک سے بالاتر ہو کر انسان کو یکجا کرنے کے لئے کیا گیا۔ (گفتارِ اقبالؒ صفحہ ۲۲)

اور آخر میں ضربِ کلیم کے یہ چند اشعار جن میں اس پیغام کو باندازِ نو عام کیا گیا کہ

اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام — پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدتِ آدم
تفریقِ ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود — اسلام کا مقصود فقط ملتِ آدم
مکے نے دیا خاکِ جنیوا۱؎ کو یہ پیغام — جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم! (صفحہ ۵۵)

دنیائے حرم میں منعقد شدہ اسلامی کانفرنس سے یہ پیغام سننے اور اس کے حصول کے لئے عملی پروگرام دیکھنے کی متوقع تھی۔ وحدتِ اُمّت، وحدتِ مملکت اور پھر وحدتِ آدم۔ یہ ہے اسلام کا منتہیٰ۔ اس میں شبہ نہیں کہ حالاتِ موجودہ اس منتہیٰ تک بتدریج ہی پہنچا جا سکتا ہے لیکن مسلمانوں کی موجودہ مملکتوں کو اس منتہیٰ کو اپنا نصب العین قرار دینے کا اعلان تو کرنا چاہیئے اور پھر اس کی طرف عملی اقدام اٹھانا۔ ٹوئن بی نے کہا تھا کہ ہمیں کم از کم مسلمانوں سے یہ توقع ضرور ہے کہ وہ نوعِ انسان کو موجودہ جہنم سے نکالنے کے لئے عملی اقدام کریں گے۔ سوچیے کہ دنیا کس طرح للچائی ہوئی نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہی اور کس حسرت سے کہہ رہی ہے کہ؎

تماشا کر اے محوِ آئینہ داری — تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں!

(۱)

۱؎ اُس زمانے میں (سابقہ) لیگ آف نیشنز کا صدر مقام جنیوا تھا۔

شناسائے اقبالؒ — سید نذیر نیازی

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اِک شمع رہ گئی تھی، سو وہ بھی خموش ہے

سید نذیر نیازی کی آخری کتاب — دانائے راز — پر تبصرہ کرتے ہوئے طلوعِ اسلام بابت نومبر ۱۹۸۰ء میں لکھا تھا:-

نیازی صاحب نے لکھا ہے کہ اگر حضرت علامہ (اقبالؒ) کے سوانح حیات اِسی اسلوب و انداز سے مرتب کئے جائیں تو وہ شاید آٹھ دس جلدوں پر پھیل جائیں۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ ہم بالتخصیص کسے یہ مشورہ دیں، لیکن جو کوئی بھی اسے درخورِ اعتنا سمجھے ہم اُس کی خدمت میں عرض کریں گے کہ وہ ایسا انتظام کر دیں کہ نیازی صاحب اِس منصوبہ کو تکمیل تک پہنچا سکیں۔ ان کی عمر اب اسّی برس سے اوپر ہو چکی ہے۔ فطرت کی طرف سے انہیں جس قدر مہلت مل پائے، اس میں اُن سے یہ کام لے لینا چاہیئے کہ

بعد من ناید چوں من مردِ فقیر

معلوم یہ الفاظ کس کیفیت کے تحت لکھے گئے تھے کہ (غالب کے الفاظ میں) حریفِ خامہ، نوائے سروش ثابت ہوئی اور ابھی اِن سطور کی روشنائی بھی خشک نہ ہونے پائی تھی کہ وہ مردِ فقیر ہم سے رُو مڑ کر چلا گیا۔

اب اُسے ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر

اور اس طرح اچانک، کہ جب یہ زہرہ گداز خبر مجھ تک پہنچی ہے تو اسے صحیح تسلیم کرنے کو دل مانتا ہی نہیں تھا۔ جب وہ آخری مرتبہ ملے ہیں تو حسبِ معمول تندرست اور ہشاش بشاش تھے۔ غالب نے (غالباً) انہی کو دیکھ کر کہا تھا کہ ؎

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام — ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

یا خود انہوں نے ہی کہا ہو کہ ؎

عمر بھر جی کے بھی جینے کا نہ انداز آیا! — زندگی چھوڑ دے پیچھا مرا، میں باز آیا

نیازی صاحب (جنہیں مرحوم کہتے ہوئے جگر شق ہوتا ہے!) اور زندگی کے مابین اِس تنازعہ کا فیصلہ کیسے بھی ہوا ہو، زندگی اب بہرحال عمر بھر بیٹھی ردیا کرے گی کہ یہ میں نے کیا کر دیا؟ طاب لہٗ وحسن مآب۔

مرحوم سے میرے تعلقات قریب پچاس سال کے عرصہ پر پھیلے ہوئے تھے۔ ابتدائی تعارف کے ربط کی کڑی علامہ اسلم جیراجپوری (علیہ الرحمۃ) تھے، جو میرے بھی اُستاد تھے اور اُن کے بھی۔ لیکن اس ربط نے قربت کی شکل اس وقت اختیار کی جب انہوں نے ماہنامہ طلوعِ اسلام کے اجراء کا فیصلہ کیا۔ اس قربت کی بنیاد کیا تھی، اسے خود اُن کی زبانی سنیئے۔ اُن کا معمول تھا (اور کس قدر مبنی بر محبت اور خلوص معمول!) کہ اُن کی جب بھی کوئی نئی کتاب شائع ہوتی، وہ اس کا اوّلین نسخہ خود لے کر میرے پاس تشریف لاتے۔ "اقبالؒ کے حضور" کا ہدیۂ اخلاص لے کر آئے تو اس کے سرورق پر لکھا تھا:-

محبّی پرویز صاحب!

یہ کتاب جیسے بنی چھپی ——— اور جیسی بھی چھپی ——— حاضر ہے۔

"من و تو ہر دو خواجہ تاشانیم

بندۂ بارگاہِ "اقبالیم"

یہ تھی ان تعلقات کی بنیاد۔ اور ان کی نوعیت کے متعلق اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس چالیس پچاس سال کے عرصہ میں، کشیدگی تو ایک طرف، کبھی لمحہ بھر کے لئے کبیدگی تک بھی پیدا نہیں ہوئی۔ اگرچہ بعض نظریات میں مجھے ان سے اختلاف بھی رہا۔ ان کی کیفیت ——— باضطرابِ موج، سکونِ گہر ——— کی سی تھی۔

میں نے اُوپر طلوعِ اسلام کا ذکر کیا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ علامہ اقبالؒ کے ارشاد یا ایما پر نیازی (مرحوم) نے دہلی سے ماہنامہ طلوعِ اسلام کا اجراء کیا۔ اس کا پہلا پرچہ، اکتوبر ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا اور دو (یا تین) پرچوں کے بعد، وہ لاہور منتقل ہو گئے۔ اس کے بعد مئی ۱۹۳۶ء تک اس کے کل چھ پرچے شائع ہوئے اور پھر وہ بند ہو گیا۔ علامہ اقبالؒ کو اس کا بڑا افسوس تھا اور وہ چاہتے تھے کہ وہ کسی طرح دوبارہ جاری ہو جائے۔ یہ دوبارہ، میری زیرِ نگرانی، دہلی سے شائع ہوا۔ اس کا پہلا پرچہ تو مئی ۱۹۳۸ء کا، لیکن وہ شائع حضرتِ علامہؒ کی وفات سے کچھ دن پہلے (اپریل میں) ہو گیا تھا۔ مسلک اس پرچہ کا بھی وہی تھا ——— یعنی فکرِ قرآنی کی روشنی میں، ملت کے مسائل کا حل۔ نیازی (مرحوم) نے اس کا نہایت خندہ پیشانی سے استقبال کیا۔ اس اشتراکِ مقصد کی بنا پر میرے ساتھ ان کے تعلقات اور بھی قریب ہو گئے۔

اپنے طویل عرصے کی ہم سفری سے، نیازی (مرحوم) کی زندگی کے متعلق میں جس نتیجہ پر پہنچا وہ یہ تھا کہ وہ ایک نابغہ (GENIUS) تھے، اور جیسی ایک نابغہ کی زندگی ہونی چاہیئے، ویسی ہی اُن کی زندگی تھی۔ زندہ قومیں اپنے نابغہ کے لااُبالی پن کی ناز برداری کرتی ہیں اور انہیں فکرِ دنیا سے آزاد کر دیتی ہیں۔ یہ کاروباری دنیا کے لوگ ہوتے ہی نہیں۔ لیکن مردہ یا بہ روبہ انحطاط قومیں اُسے دیوانہ سمجھ کر پتھر مارتی ہیں۔ نیازی تو پھر بھی اقبالؒ شناس تھا، ہم نے خود اقبالؒ کے ساتھ جو کچھ کیا، وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ اس مردہ پرست قوم نے رحلت کے بعد جفا سے توبہ کرلی ہے، جتنا کچھ اقبالؒ کے مقبرہ پر صرف کیا، اور اس چالیس سال کے عرصہ میں جتنے خزانے اُس کے نام پر لٹائے گئے اور لٹائے جا رہے ہیں، اس کا عشرِ عشیر بھی اس کی زندگی میں اس پر صرف کر دیتے تو معلوم وہ قوم کو کتنا کچھ

اور دے جاتے۔ حقیقت یہ ہے کہ علامہؒ نے جتنا کچھ ہمیں دیا ہے، وہ اس معدنِ فکر کا دس فی صد بھی نہیں جسے وہ اپنے ساتھ زیرِ زمین لے گئے ہیں۔ یہی کچھ نیازی (مرحوم) کے متعلق کہا جائے گا۔ ہماری حالت یہ ہے کہ اگر ہم کسی موچی سے جوتا گنٹھواتے ہیں تو اس کی مزدوری اس کا حق سمجھتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی مفکر، قوم کے مسائل کے حل کی فکر میں بیٹھا اپنا خون خشک کرتا ہے، تو ہم طعنہ دیتے ہیں کہ وہ بیکار کیوں بیٹھا رہتا ہے۔ کچھ کام کیوں نہیں کرتا؟ چنانچہ وہ بھوکوں مرجاتا ہے۔ قوم کی اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ اس میں "مفکر" پیدا ہونے ہی بند ہو گئے ہیں۔ اور (علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں) "جس قوم میں فکر کی صلاحیت نہیں رہتی، وہ تباہ ہو جاتی ہے۔"

نیازی (مرحوم) کی اقبالؒ شناسی، دقتِ نظر، وسعتِ علم اور عمقِ فکر کی اس سے بڑھ کر شہادت اور کیا ہو سکتی ہے کہ اپنے خطبات کے ترجمہ کرنے کے لئے علامہ اقبالؒ کی نگاہِ انتخاب نیازی صاحب پر پڑی۔ حالانکہ اس وقت ان کی عمر بمشکل تیس سال کی تھی۔ حضرتِ علامہؒ کو اس کا خوب اندازہ تھا کہ یہ کام نیازی (مرحوم) کے سوا کوئی اور نہیں کر سکے گا۔ اور اسے تسلیم کرنا پڑے گا کہ جس طرح حضرت علامہؒ کے وہ خطبات اپنا جواب نہیں رکھتے ــــ نیازی (مرحوم) کا ترجمہ بھی منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ ان خطبات پر حواشی اور توضیحات کی ضرورت کا احساس خود حضرت علامہؒ کو بھی تھا اور دیگر اربابِ فکر و نظر کو بھی، لیکن اس کی آج تک کسی کو ہمت نہیں پڑی۔ اس کی باندازِ دگر ایک جھلک نظر آئی تو نیازی (مرحوم) ہی کی ایک اور تصنیف ــــ اقبالؒ کے حضور میں ــــ میں نظر آئی۔ اس کتاب کے مطالعہ سے بھی یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ فہمِ اقبالؒ میں ان کی نگاہ کن گہرائیوں تک پہنچی ہوئی تھی اور علم کے متنوع گوشوں اور شعبوں میں ان کے تبحر کا کیا عالم تھا ــــ اور یہ سب کچھ بایں شانِ بے نیازی کہ کوئی ناواقف ان سے ملے تو اسے اس کا گمان تک نہ گزرے کہ یہ شخص کچھ پڑھا لکھا بھی ہے۔ ناواقف تو ایک طرف، میں سمجھتا ہوں کہ مرحوم کے واقفوں میں سے بہت کم ایسے ہوں گے جنہیں ان کے فکری تعمق، علمی وسعت اور اس کے ساتھ قرآنی حقائق پر گہری نگاہ کا صحیح صحیح اندازہ ہو۔

اس قسم کے علمی اور فکری ذہن کے لوگ عام طور پر ایسے حاد و یابس ہوتے ہیں کہ ان کے ماتھے پر ہر وقت جعفر کے تفنت کے بل چڑھے رہتے ہیں۔ لیکن یہ (غالباً علامہ اقبالؒ کے قرب کا اثر تھا) کہ نیازی (مرحوم) نے طبیعت بڑی شگفتہ اور بشاش پائی تھی۔ ان کی شخصیت محفل ساز تھی اور حاضر جوابی اور بذلہ سنجی میں بھی ان کا جواب نہیں تھا۔ لیکن اس کی سطح بھی بڑی بلند ہوتی تھی۔ تنقید ان کی بڑی بے پناہ ہوتی تھی۔ اکثر لوگوں کو ان کی بے باکی کی شکایت رہتی تھی، لیکن ان کی بے باکی، حق گوئی کی مظہر ہوتی تھی۔ چونکہ ان کی اپنی طبیعت میں منافقت نہیں تھی، اس لئے وہ منافقت کو کسی گوشے میں بھی برداشت نہیں کرتے تھے۔ اور جس بات کو حق سمجھتے اسے، لگی لپٹی رکھے بغیر، بے باکانہ کہہ دیتے۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے، اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں، بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

ان کی پریشانیوں کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ ان کے حلقہ احباب میں نہیں، زمرۂ تلامذہ میں بھی ایسے لوگ تھے جو اعلیٰ مناصب پر فائز تھے، وہ ذرہ بھی مصلحت بینی کی رعایت رکھتے تو اس قدر پریشان کبھی نہ رہتے۔

اپنی نجی زندگی کے علاوہ انہیں تصنیف و تالیف کے امور میں بھی بڑی دشواریاں پیش آئیں۔ انہوں نے ان کا اجمالی سا تذکرہ "دانائے راز" میں کیا ہے، اور اس کا جو نسخہ مجھے مرحمت فرمایا، اس کے سرورق پر لکھا ہے:۔

یہ سوانح حیات نہ حسبِ منشا لکھی گئی۔ نہ چھپ سکی۔ مگر یہ ایک طویل داستان ہے۔ ملاقات پر عرض کروں گا۔

نیازی

یکم ستمبر ۱۹۸۰ء

میں سمجھتا ہوں کہ یہ انہی کی ہمت تھی جو اس قدر ناسازگار۔ حالات کے باوجود ہمیں ایسا کچھ دے گئے جس کا بدل نہیں۔ وہ اکثر و بیشتر موضوعات کو یونہی چھوکر چھوڑ گئے ہیں۔ لیکن جس موضوع کو وہ جہاں چھوڑ گئے ہیں، اُسے آگے بڑھانے والا اب کوئی نظر نہیں آتا۔ یہی علامہ اقبالؒ کے ساتھ ہوا۔ یہی نیازی (مرحوم) کے ساتھ ہوگا۔

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات　　تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

کتنی بڑی ہے قوم کی یہ محرومی اور حرماں نصیبی!

لیکن اس کا احساس کس کو ہے؟ وہ ساری عمر انہی سڑکوں پہ مارا مارا پھرتا رہا، تو کسی کو احساس نہ ہوا کہ کتنا بڑا گوہر بے بہا مٹی میں رُل رہا ہے۔ اب کسے احساس ہوگا کہ ہم سے کیا چھن گیا ہے؛ اور اگر احساس ہوا بھی تو اس سے فائدہ کیا؟ ——— پس ازاں کہ من نہ مانم بچہ کار خواہی آمد ——— سچ پوچھیے تو نیازی کی وفات نہیں ہوگیا ہم سے اقبالؒ بچھڑ گیا ہے!

اگر کسی نے مرحوم کے لوحِ مزار پہ کچھ لکھنا ہو تو اس سے موزوں تر اور کیا ہوگا کہ

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

برگِ شاخِ خزاں دیدہ

پرویز

ضرورت ہے:

ادارہ طلوعِ اسلام کے لئے ایک محرّر کی ضرورت ہے جو اُردو خوشخط لکھ سکے۔ قرآنی آیات صحیح نقل کر سکے۔

طلوعِ اسلام کے معیار کی زبان میں اِملا لے سکے۔ اور کتابت شدہ کاپیاں دیکھ سکے۔ مشاہرہ معقول دیا جائے گا۔ خط میں اپنی تعلیمی قابلیت کی وضاحت کیجیے۔

ناظم۔ ادارہ طلوعِ اسلام۔ ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور

پاکستان خود ایک ریفرنڈم کے نتیجہ میں وجود میں آیا تھا

اب پھر

ریفرنڈم

کاہے کے لئے

پرویز

باسمہٖ تعالیٰ

مجھے آہ و فغانِ نیم شب کا پھر پیام آیا！
تھم اے رہرو! کہ شاید پھر کوئی مشکل مقام آیا

پاکستان خود ایک ریفرنڈم کے نتیجہ میں وجود میں آیا تھا

پرویز

تحریکِ پاکستان کے دوران، اور تشکیلِ پاکستان کے بعد اس وقت تک، میرے وقت کا بیشتر حصّہ، مخالفینِ پاکستان کے اعتراضات کا جواب دینے میں گزرا ہے۔ جزئیات تو ان کی بکثرت تھیں، لیکن اصولاً یہ اس قسم کے تھے کہ (۱) یہ غلط ہے کہ اسلام میں قومیّت کی بنیاد ایمان کا اشتراک ہے۔ قومیت کی بناء اشتراکِ وطن ہے۔ (۲) یہ صحیح نہیں کہ مسلمانوں کی ایک آزاد مملکت کا قیام اسلام کا تقاضا ہے۔ اسلام ایک مذہب ہے اور مذہب کو مملکت اور حکومت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ (۳) سیکولر نظامِ حکومت اسلام کے خلاف نہیں۔ ہندوستان کی سیکولر حکومت میں ہمیں مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ وغیرہ وغیرہ۔ جب چیف جسٹس (ریٹائرڈ) محترم محمد منیر نے اپنی کتاب (FROM JINNAH TO ZIA) میں یہ لکھا تھا کہ قائدِ اعظمؒ، پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے تو یہ ایک ایسا دعویٰ تھا جو اس سے پہلے کسی نے نہیں کیا تھا۔ چنانچہ میں نے اس کی تردید میں ایک مفصّل، مدلّل اور مستند مقالہ لکھا جس کا عنوان تھا۔ "کیا قائدِ اعظم، پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے"۔ جو روزنامہ نوائے وقت کی ۱۷ اکتوبر ۱۹۸۰ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔ یہ اتنا مقبول ہوا کہ مکتبہ ندائے ملت نے اسے ایک پمفلٹ کی شکل میں شائع کیا پھر یہ ماہنامہ طلوعِ اسلام کی دسمبر ۱۹۸۰ء کی اشاعت میں شائع ہوا اور انہوں نے بھی اس کا پمفلٹ الگ چھاپا۔ یہ مقالہ اس قدر مسکت تھا کہ کہیں سے اس کی نہ تردید ہوئی نہ مخالفت۔ یہ امر میرے لئے وجہ اطمینان تھا کہ اس سے کم از کم، ہماری نئی نسل کے سامنے یہ حقیقت آگئی کہ پاکستان کے حصول کا مقصد اسے سیکولر سٹیٹ نہیں بلکہ اسلامک سٹیٹ بنانا تھا۔

اس کے بعد یہ بات کسی کے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آسکتی تھی کہ پاکستان کے مسلمانوں سے یہ دریافت کرنے کی بھی ضرورت پڑے گی کہ تم اس مملکت کو اسلامی بنانا چاہتے ہو یا سیکولر؟ اس قسم کی آواز کا مطلب یہ ہوگا کہ قائدِ اعظمؒ تو بے شک اسے اسلامی مملکت بنانا چاہتے تھے لیکن اس باب میں شبہ ہے کہ آیا قوم بھی ایسا چاہتی تھی یا نہیں؟ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ قائدِ اعظمؒ (کم و بیش) دس سال تک جو آواز مسلسل و پیہم بلند کرتے رہے، وہ تنہا ان کی آواز تھی۔ قوم ان کی ہمنوا نہیں تھی۔ وہ اکیلے ایک جھنڈی ہاتھ میں لے کر، قریہ قریہ، بستی بستی، کوچہ کوچہ گاتے پھرتے تھے کہ ؎

پاکستان کا مطلب کیا۔ لا الٰہ الا اللہ

ان کے پیچھے کوئی بھی ان کا ہم آہنگ نہیں تھا! پاکستان بننے کے بعد یہ "بھیڑ" ان کے پیچھے بلا سوچے سمجھے چلی آئی۔ اب ضرورت محسوس ہوئی ہے کہ ان سے پوچھا جائے کہ تم یہاں آئے کس لئے تھے؟

قبل اس کے کہ میں عرض کروں کہ اس قسم کی آواز میں پاکستان کے لئے کس قدر خطرات مضمر ہیں، میں اس حقیقت کو نمایاں طور پر سامنے لانا چاہتا ہوں کہ پاکستان خود ایک ریفرنڈم کے نتیجہ میں وجود میں آیا تھا۔ اس "ریفرنڈم" میں مسلمانانِ ہند سے یہ نہیں پوچھا گیا تھا کہ تم ایک الگ مملکت چاہتے ہو یا نہیں۔

بنیادی ریفرنڈم

پوچھا یہ گیا تھا کہ تم ہندوستان کی سیکولر سٹیٹ میں رہنا چاہتے ہو یا پاکستان کی اسلامک سٹیٹ میں؟ بالفاظِ دیگر، وہاں مایہ النزاع سوال یہ نہیں تھا کہ مسلمان اپنی الگ مملکت چاہتے ہیں۔ نزاع اس مسئلہ پر تھی کہ مسلمان ایک اسلامی مملکت بنانا چاہتے ہیں۔ ہندوؤں کو اعتراض اس پر تھا کہ مسلمان اسلامک سٹیٹ کیوں بنانا چاہتے ہیں۔ اور مسلمانوں کا جواب یہ تھا کہ بے شک ہم ایسا چاہتے ہیں، اور ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ ہم ایسا کر کے رہیں گے۔

یہ بات شاید آج بعض (ناواقف) حضرات کے لئے وجہِ تعجب ہو کہ مسلمانوں کا مطالبہ محض ایک الگ مملکت کی تشکیل کا نہیں تھا، اسلامی مملکت کی تشکیل کا تھا۔ اور مخالفین کو بھی ان کی الگ مملکت کی تشکیل پر اتنا اعتراض نہیں تھا جتنا اعتراض اس مملکت کے اسلامی ہونے پر تھا۔ میں اس کی تائید میں دو چار مثالوں پر اکتفا کروں گا۔

اس نزاع میں سب سے اہم بحث وہ ہے جو علامہ اقبالؒ اور (مولانا) حسین احمد مدنی میں چھڑی تھی۔ اپنے اپنے حلقہ میں ان ہر دو حضرات کا جو مقام تھا اس سے سب واقف ہیں۔ مولانا مدنیؒ نے کہا تھا کہ اس وقت اوّلیں اور بنیادی مسئلہ انگریزوں سے آزادی حاصل کرنا ہے۔ مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ ہندوؤں (یا کانگریس) کے ساتھ مل کر اس مقصد کے حصول کے لئے متحدہ کوشش کریں۔ اس کے جواب میں علامہ اقبالؒ نے لکھا تھا:۔

علامہ اقبالؒ کا بیان

مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریز کی غلامی کے بند توڑنا اور اس کے اقتدار کو ختم کرنا ہمارا فرض ہے لیکن آزادی سے ہمارا مقصد یہ نہیں کہ ہم آزاد ہو جائیں بلکہ ہمارا اوّل مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے اور مسلمان طاقتور بن جائے۔ اس لئے میں کسی ایسی حکومت کے قیام میں مددگار نہیں ہو سکتا جس کی بنیادیں انہی اصولوں پر ہوں،

جس پر انگریزی حکومت قائم ہے۔ ایک باطل کو مٹا کر دوسرے باطل کو قائم کرنا چہ معنی دارد؟ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کلیتہً نہیں تو ایک بڑی حد تک دار الاسلام بن جائے۔ لیکن اگر آزادئ ہند کا نتیجہ یہ ہو کہ جیسا دار الکفر ہے ویسا ہی رہے یا اس سے بھی بدتر بن جائے تو مسلمان ایسی آزادئ وطن پر ہزار مرتبہ لعنت بھیجتا ہے۔ ایسی آزادی کی راہ میں مکھنا، بولنا، روپیہ صرف کرنا، لاٹھیاں کھانا، جیل جانا، گولی کا نشانہ بننا سب کچھ حرام اور قطعی حرام سمجھتا ہوں۔

(بیان علامہ اقبالؒ۔ الموسوم بہ "معرکۂ دین و وطن")

اس کے بعد (مطالبۂ پاکستان کے مقصد کے متعلق) انہوں نے فرمایا:۔

ہندوستان دنیا بھر میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے..... حقیقت یہ ہے کہ اسلام، خدا اور بندے کے درمیان ایک روحانی واسطہ کا نام نہیں۔ یہ ایک نظامِ حکومت ہے..... اور ظاہر ہے کہ یہ چیز اپنی آزاد مملکت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ (خطبۂ الٰہ آباد)

اسی سلسلہ میں قائدِ اعظمؒ کا ایک ارشاد بھی ملاحظہ فرمائیے۔ انہوں نے ۱۸ جون ۱۹۴۵ء کو فرنٹیئر مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے نام اپنے پیغام میں فرمایا تھا:۔

قائدِ اعظمؒ کی وضاحت

پاکستان سے یہ مطلب نہیں کہ ہم غیر ملکی حکومت سے آزادی چاہتے ہیں۔ اس سے حقیقی مراد مسلم آئیڈیالوجی ہے جس کا تحفظ نہایت ضروری ہے۔ ہم نے صرف اپنی حکومت حاصل نہیں کرنی۔ ہم نے اس قابل بھی بننا ہے کہ ہم اس کی حفاظت بھی کر سکیں اور اسلامی تصورات اور اصولات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ (تقاریر۔ جلد دوم۔ صـ۲۶۳)

اس مملکت کے حاصل ہو جانے کے بعد بھی قائدِ اعظمؒ اس حقیقت کو دہراتے رہے کہ قیامِ مملکت مقصود بالذات نہیں۔ مقصود بالذات اس مملکت کا اسلامی ہونا ہے۔ چنانچہ انہوں نے تشکیلِ پاکستان کے دو ہی ماہ بعد گورنر جنرل کی حیثیت سے، ارکانِ حکومت سے اپنے اوّلین خطاب (اکتوبر ۱۹۴۷ء) میں کہا:۔

پاکستان کا قیام جس کے لئے ہم گذشتہ دس سال سے مسلسل کوشش کر رہے تھے اب خدا کے فضل سے ایک حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آ چکا ہے۔ لیکن ہمارے لئے اس آزاد مملکت کا قیام مقصود بالذات نہیں تھا بلکہ ایک عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ ہمیں ایک ایسی مملکت مل جائے جس میں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں اور جس میں ہم اپنی روشنی اور ثقافت کے مطابق نشوونما پا سکیں۔ اور اسلام کے عدلِ عمرانی کے اصول آزادانہ طور پر رو بہ عمل لا سکیں۔ (تقاریر بہ حیثیت گورنر جنرل۔ صـ۲۲)

ہندو کی مخالفت

یہ تھا بہر حال، تحریکِ پاکستان کے دوران مسلمانوں کا مطالبہ۔ یعنی ایک اسلامی مملکت کا قیام۔ اور اسی مطالبہ کی مخالفت ہندوؤں کی طرف سے ہوئی تھی۔ (مثلاً) قائدِ اعظمؒ کے اس مطالبہ کے جواب میں، مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی نے، ایوانِ اسمبلی میں (جس میں وہ کانگریس پارٹی کے

لیڈر تھے) پکار کر کہا کہ

اب یہ ممکن ہے کہ کوئی ایسا نظامِ حکومت قائم کیا جاسکے جس کی بنیاد مذہب پر ہو۔ اب وقت آچکا ہے کہ ہم اعتراف کرلیں اور اسے اچھی طرح یقین کرلیں کہ ضمیر، مذہب اور خدا کو ان کے مناسب مقام، یعنی آسمان کی بلندیوں پر رکھ دیا جائے اور انہیں خواہ مخواہ زمین کے معاملات میں گھسیٹ کر نہ لایا جائے۔ (ہندوستان ٹائمز۔ ۵ / ۹ / ۴۳)

اس پر حاشیہ آرائی کرتے ہوئے، کانگریس کے نقیب، جریدہ ہندوستان ٹائمز نے اپنی اشاعت بابت (۱۴ / ۱۱ / ۳۹) میں لکھا:-

حکومتِ الٰہیہ کا تصور ایک داستانِ پارینہ بن چکا ہے اور مسلمانوں کا فعل عبث ہوگا اگر وہ، ہندوستان جیسے ملک میں اس کے احیاء کی کوشش کریں جہاں مختلف جماعتیں ایک دوسرے میں گھلی ملی ہوئی ہیں۔ یا اس امر کا خیال کریں کہ اس مقصد کے لئے ملک کو دو حصوں میں تقسیم کردیا جائے۔ یہ علامت خوش آئندہ ہے کہ مسلمانوں کے ذمہ دار راہ نما اس سراب کے پیچھے لگنا نہیں چاہتے۔

(ان ذمہ دار راہ نماؤں سے مراد نیشنلسٹ مسلمانوں سے تھی جو کانگریس کے چند تھے)۔

سنہ ۱۹۴۰ء کا ذکر ہے کہ یہ تجویز سامنے لائی گئی کہ مسلم لیگ اور کانگریس پر مشتمل مخلوط حکومتیں قائم کرلی جائیں۔ اس پر اس زمانے کے مشہور کانگریسی لیڈر، مسٹر ستیا مورتی نے کہا کہ

جس مسلم لیگ کا نصب العین یہ ہو کہ ملک میں اسلامی حکومت قائم کی جائے، ہم اس کے ساتھ مل کر کس طرح حکومتیں بنا سکتے ہیں! (ہندوستان ٹائمز ۱۱ / ۶ / ۴۰)

اب آئیے ہندوستان کے سب سے بڑے لیڈر، مسٹر گاندھی کی طرف جو قائداعظمؒ کے براہِ راست حریف تھے۔ جب سنہ ۱۹۴۰ء کی قرارداد پاکستان منظور ہوئی تو اس پر تبصرہ کرتے ہوئے، انہوں (مسٹر گاندھی) نے لکھا تھا:-

اگر مذہب کو علیٰحدہ رہنے دیا جائے۔ یعنی ایک نج کا معاملہ اور خدا اور بندے کے درمیان ایک ذاتی تعلق تو پھر ہندوں اور مسلمانوں کے کئی ایک مشترک عناصر نکل آئیں گے جو مجبور کرینگے کہ یہ دونوں ایک مشترکہ زندگی بسر کریں اور ان کی راہ عمل بھی مشترک ہو۔
(ہندوستان ٹائمز۔ ۹ / ۶ / ۴۰)

"مشترکہ زندگی بسر کرنے" سے جس طرف اشارہ تھا وہ واضح تھا!

"اسلامی حکومت" کا تصور (اور مطالبہ) ان کے (مسٹر گاندھی کے) اعصاب اس قدر سوار تھا کہ وہ اٹھتے بیٹھتے اس کی مخالفت میں کچھ نہ کچھ کہتے رہتے تھے۔ (مثلاً) انہوں نے سنہ ۱۹۴۶ء میں لکھا:-

اگر میں ڈکٹیٹر ہوتا تو مذہب اور حکومت کو الگ الگ کردیتا۔ مجھے میرے مذہب کی قسم! میں اس کے لئے جان تک دے دیتا..... مذہب ہر شخص کا پرائیویٹ معاملہ ہے۔ اسے حکومت سے کیا واسطہ! (ہریجن۔ ۹ / ۱۱ / ۴۶)

تشکیلِ پاکستان کے بعد تک بھی ہندوؤں کے دل میں یہ آرزو مچلتی رہی کہ اگر مسلمان، اسلامی مملکت کے تصور کو خیرباد کہہ دیں تو ان کے ساتھ مصالحت کی کئی شکلیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ ان کا خیال یہ تھا کہ یہ مطالبہ محض قائدِاعظمؒ کی ضد تھی۔ چنانچہ جب ان کا انتقال ہوا تو انہوں نے سمجھا کہ اس قسم کی مفاہمت کے لئے موقعہ نہایت موزوں ہے۔ چنانچہ ہندوستان ٹائمز نے اپنی ۱۹ اکتوبر ۱۹۴۸ء کی اشاعت کے مقالہ افتتاحیہ میں پہلے لکھا کہ

> پاکستان بالخصوص مشرقی پاکستان کی اقلیتوں کو اتنا خوف و ہراس اور کسی چیز سے پیدا نہیں ہوا جتنا اس حقیقت سے کہ پاکستان کے راہ نماؤں نے متعدد بار اعلان کیا ہے کہ وہ پاکستان میں اسلامی اصول و روایات کے مطابق ایک اسلامی مملکت قائم کرنا چاہتے ہیں۔

اس کے بعد اس نے لکھا:-

> اگر کشمیر کا مسئلہ پُرامن طریق سے طے ہو جائے اور پاکستان، اسلامک سٹیٹ کے خیال کو ترک کر دے اور اپنے سامنے ایک جمہوری ریاست کی تشکیل کا نصب العین رکھے تو اس سے پاکستان اور ہندوستان اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں خوشگوار تعلقات کا ایک نیا دور شروع ہو جائے گا۔

آپ نے غور فرمایا کہ مطالبۂ پاکستان کے سلسلہ میں مابہ النزاع مسئلہ کیا تھا؟ یہ کہ مسلمان، ایک اسلامی مملکت کی تشکیل چاہتے تھے اور ہندو اس کی مخالفت کرتے تھے اور کہتے تھے کہ وہ سیکولر سٹیٹ قائم کریں۔ اسی مسئلہ پر وہاں ریفرنڈم ہوا۔ اور یہ ریفرنڈم تھا ۱۹۴۵-۴۶ء کے انتخابات۔ ان میں دیکھنا یہ تھا کہ اسلامی سٹیٹ کا مطالبہ محض قائدِاعظمؒ یا ان کے چند رفقاء کے ذہن کی تخلیق ہے یا مسلم عوام بھی اس میں ان کے ہم نوا ہیں۔ وہ الیکشن درحقیقت اسی ایشو پر ہونے تھے۔ اور ان کے نتائج نے بحقیقت نقش بر سنگ کر دی کہ ہندوستان کا مسلمان بالاجماع اس مطالبہ کے ساتھ ہے۔ مرکزی اسمبلی میں تیس کی تیس نشستیں لیگی امیدواروں نے جیت لیں اور صوبائی اسمبلیوں میں انہیں (۴۹۵) میں سے (۴۴۰) نشستیں (یعنی ۸۸ء۸ فی صد) حاصل ہوئیں۔ ان نتائج کے پیشِ نظر، ساری دنیا نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا کہ قائدِاعظمؒ مسلمانانِ ہند کے واحد نمائندہ ہیں۔ (مثلاً) مسٹر مورؔ نے اپنی کتاب (DIVIDE & QUIT) میں لکھا:-

> مسٹر جناحؒ کا دعویٰ کہ وہ مسلمانانِ ہند کے واحد نمائندہ ہیں، بلاخوف و تردید پایۂ ثبوت تک پہنچ گیا ہے۔

مسٹر (RUSH BROOK) نے اپنی کتاب (THE STATE OF PAKISTAN) میں لکھا:-

> اخبار ٹائمز، برطانیہ کے باشندوں کو بار بار متنبہ کرتا رہا کہ ایک آزاد مسلم مملکت کے قیام کے لئے مسٹر جناحؒ جس تحریک کی قیادت کر رہے ہیں، اس کی قوت کا صحیح اندازہ نہ لگانا بڑا خطرناک ہوگا۔ ان انتخابات میں جو کامیابی مسلم لیگ اور مسٹر جناحؒ کو حاصل ہوئی ہے اس نے اس نقطۂ نظر کی کامل توثیق کر دی ہے۔

یہ تھا وہ ملک گیر ریفرنڈم جس نے ہمیشہ کے لئے فیصلہ کر دیا کہ اسلامی مملکت کا مطالبہ تنہا قائدِاعظمؒ کی آواز

ریفرنڈم

نہیں تھی۔ مسلم انڈیا پورے کا پورا ان کا ہمنوا تھا ——— اور اسی ریفرنڈم کے نتیجہ میں پاکستان وجود میں آگیا۔
فرمائیے! کیا ان مسلمانوں سے، جن کی متفق آراء سے پاکستان ایک اسلامی مملکت بننے کے لئے وجود میں آیا تھا، یہ پوچھنے کی ضرورت باقی ہے کہ تم پاکستان کو اسلامی مملکت بنانا چاہتے ہو یا نہیں؟ اس قسم کا سوال ایک دفعہ قائداعظمؒ کے سامنے بھی آیا تھا، اور اس کے جواب میں انہوں نے جو کچھ کہا تھا اس کا اطلاق آج بھی اسی طرح، بلکہ اس سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ ہوتا ہے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے تیرھویں سالانہ اجلاس (منعقدہ دہلی - بابت ۲۴ر اپریل سنہ ۱۹۴۳ء) میں انہوں نے ایک نہایت اہم برجستہ خطاب ارزانی فرمایا۔ اس کے دوران، آئین پاکستان کے متعلق بھی بات چھڑی۔ انہوں نے کہا:۔

> پوچھا یہ جارہا ہے کہ پاکستان کا آئین کیا ہوگا؟ کیا اس میں حکومت اسلامی ہوگی؟ ظاہر ہے کہ اس قسم کے سوالات اٹھانے کا مقصد غلط فہمیاں پھیلانے اور شرارتیں انگیخت کرنے کے سوا کچھ نہیں ہے؛ اس لئے کہ یہ مسئلہ ایسا بدیہی اور واضح ہے کہ اس باب میں کسی قسم کے سوال پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑ سکتی۔ پاکستان کا آئین ملت پاکستانیہ نے مرتب کرنا ہے۔ آپ اس کے لئے اپنے آپ کو تیار کیجئے تاکہ آپ ایسا آئین مرتب کر سکیں جو آپ کی دلی تمناؤں کا آئینہ دار ہو۔ جب واقعہ یہ ہے تو پھر اس قسم کے سوالات اٹھانے کا کیا یہی مطلب نہیں کہ آپ خود اپنے خلاف ملامت (CENSURE) کا ووٹ پاس کر رہے ہیں؟

یہ، پاکستان بننے سے چار سال پہلے کی بات ہے۔ قیام پاکستان کے بعد اس قسم کے سوالات کا جو جواب قائداعظمؒ کی طرف سے مل سکتا تھا، ظاہر ہے۔

——— (۰) ———

خطرات

اب آئیے ان خطرات کی طرف جن کی سمت میں نے شروع میں اشارہ کیا ہے ——— مطالبۂ پاکستان کی بنیاد دو دعاوی پر تھی - یعنی :-

۱- مسلمان، ایمان کے اشتراک کی بناء پر، غیر مسلموں سے الگ قوم ہیں۔ اسے دو قومی نظریہ کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ اور

۲- مسلمانوں کے لئے ایک الگ خطۂ زمین کی ضرورت اس لئے ہے کہ وہ اس میں اسلامی مملکت، قائم کر سکیں۔ اسے نظریۂ پاکستان کہہ کر پکارا جاتا تھا۔

اس مطالبہ کے مخالفین یہ کہہ کر اس کی مخالفت کیا کرتے تھے کہ

۱- یہ محض مسٹر جناحؒ کا وکیلانہ حربہ (STUNT) ہے۔ جسے وہ اپنا مقدمہ جیتنے کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔

۲- مسٹر جناحؒ غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ یہ اسلام کا تقاضا نہیں۔ مسلمان، ہندوستان کی جمہوری سیکولر سٹیٹ میں بھی اسلام کے مطابق زندگی بسر کر سکتے ہیں۔

۳- یہ دونوں نظریات ناممکن العمل ہیں۔ ان کی بنیادوں پر مملکت قائم نہیں ہو سکتی۔ اور اگر اسے قائم کر بھی دیا

جائے تو وہ قائم نہیں رہ سکتی۔ یہ نظریات یقیناً ناکام رہ جائیں گے۔

جب ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) الگ ہوا ہے تو ہندوستان میں شور برپا کیا گیا تھا کہ

ہندوؤں کا جشنِ مسرت

واقعات نے ثابت کر دیا کہ دو قومی نظریہ باطل اور ناممکن العمل تھا۔ انہوں نے اس پر ایک جشن منایا تھا جس میں مسز اندرا گاندھی نے کہا تھا کہ

> یہ کامیابی نہ ہماری فوجوں کی کامیابی ہے اور نہ ہماری حکومت کی کامیابی۔ یہ کامیابی ہے حق پر مبنی نظریہ کی، اس نظریہ کے خلاف جو باطل پر مبنی تھا۔ مسلمانوں نے تحریکِ پاکستان کی بنیاد ایک باطل نظریہ پر رکھی تھی۔ ہم انہیں بار بار سمجھاتے رہے کہ ان کا نظریہ غلط ہے۔ یہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے نہ مانا اور اپنی ضد پر قائم رہے۔ اب پچیس سال کے تجربہ نے بتا دیا کہ جو کچھ ہم کہتے تھے وہ حق تھا اور ان کا نظریہ باطل۔ یہ ان کے باطل نظریہ کی شکست ہے۔

اُسی زمانے میں، ہندوستان کی وزارتِ خارجہ کی طرف سے ایک رپورٹ اخبارات میں بھیجی گئی تھی جس میں کہا گیا تھا۔

> دو قوموں والا نظریہ ہی باعث تھا برصغیر کے امن و آشتی میں رخنہ اندازی کا۔ اب چونکہ یہ نظریہ مسمار ہو چکا ہے تو ہندوستان کی نظروں میں اب ہندوستان اور پاکستان کے مابین تعلقات کے معمول پر آنے اور صلح اور دوستی کے قائم ہونے کے امکانات روشن ہو گئے ہیں۔ بنگلہ دیش کے قائم ہونے سے یہ تصور بھی ختم ہو گیا ہے کہ ریاستیں مذہب کی بنیاد پر بن سکتی ہیں۔
>
> (رائٹرز ایجنسی۔ بحوالہ چٹان مورخہ ۱۵ ۵/۷۲)

یہ کچھ اُدھر (انڈیا میں) کہا جا رہا تھا۔ پاکستان میں بھی وہ "مسلمان لیڈر" براجمان تھے جنہوں نے مطالبہ پاکستان کی شدید مخالفت کی تھی۔ انہیں اس قسم کا موقعہ خدا دے۔ چنانچہ خان عبدالولی خان نے کلکتہ کے اخبار، ہندوستان اسٹینڈرڈ کے نمائندہ "سبین گپتا" کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا:۔

اندرونِ خانہ

> بنگلہ دیش کے وجود میں آ جانے سے دو قومی نظریہ غلط ثابت ہو چکا ہے۔
>
> (نوائے وقت - ۱۰ ۹/۷۲)

انہوں نے بریڈفورڈ میں پاکستانیوں کے ایک منتخب اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا:۔

> دو قومی نظریہ ختم ہو چکا ہے۔ اسلام کی باتیں ڈیڑھ ہزار سال پرانی اور فرسودہ ہیں۔ پچیس سال کے تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ نظریہ پاکستان غلط تھا۔ برصغیر کی تقسیم کے وقت اسی نظریہ کو غلط طور پر اساس بنایا گیا تھا۔ لیکن کسی بھی قوم کو زیادہ دیر تک محض جذباتی نعروں سے بے وقوف نہیں بنایا جا سکتا۔ اب بھی اس بارے میں جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ سراسر غلط ہے..... ماؤنٹ بیٹن نے جب اپنے اختیارات پاکستان کے گورنر جنرل کو تفویض کئے تھے تو ہم نے اس وقت

بھی اس کی مخالفت کی تھی۔ اس وقت ہمیں غدّار کہا گیا تھا۔ لیکن آج دنیا نے دیکھ لیا کہ پاکستان اسلام کے نام پر بنا اور اسلام ہی کے نام پر ٹوٹا ہے۔ (نوائے وقت - ۱۳ اکتوبر ۱۹۷۲ء)

صاحبزادہ صاحب یہ فرما رہے تھے، اور ادھر والدِ بزرگوار یہ "دیا کھیان" دے رہے تھے کہ

چند سال پہلے کا پاکستان اب مر چکا ہے۔ مغربی پاکستان میں چار قومیتوں کے درمیان رشتہ کے لئے اسلام کافی نہیں رہے گا۔ اس کے لئے سیکولر بنیادوں پر رشتے کی تعمیر کرنی ہوگی۔ (۱۹۷۳ء میں ٹائمز آف انڈیا کے نمائندہ مسٹر دلیپ کمار مکرجی کو انٹرویو دیتے ہوئے)۔

وہ اس سے پہلے بھی کئی بار کہہ چکے تھے کہ "میں نے دو قومی نظریہ کبھی تسلیم نہیں کیا۔"

سندھ میں مسٹر جی ایم سیّد بھی اسے اپنے دعوے کے ثبوت میں بطورِ شہادت پیش کر رہے تھے۔ انہوں نے اگست ۱۹۷۲ء میں، طلبا، اور دانشوروں کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

حالات اور واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ نظریۂ پاکستان کا کوئی وجود نہیں۔ درحقیقت سندھ کو لوٹنے کے لئے یہ ڈھونگ رچایا گیا تھا۔ (امروز۔ ۴ اگست ۱۹۷۲ء)

اوائل ۱۹۷۲ء میں انہوں نے اپنی سالگرہ کی تقریب پر تقریر کرتے ہوئے کہا:۔

پاکستان کے موجودہ انتشار اور افراتفری اور پسماندگی میں چار عناصر کا ہاتھ ہے۔ یعنی دو قومی نظریہ۔ مذہبی نظامِ حکومت کا تخیّل۔ وفاقی نظریۂ سیاست اور پڑوسی ملکوں سے دشمنی۔ ضرورت ہے کہ ۲۴ سالہ تجربہ سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کے دو قومی نظریہ کو خیرباد کہا جائے اور پاکستان میں ۵ قوموں کے وجود کو تسلیم کیا جائے۔ (المنیر۔ ۴ فروری ۱۹۷۲ء)

بلوچستان کے (اُس زمانے کے وزیرِاعلیٰ) سردار عطاء اللہ مینگل نے کہا:۔

جس دو قومی نظریہ کی اساس پر پاکستان حاصل کیا گیا تھا، وہ خلیج بنگال میں غرق ہو چکا ہے۔
(نوائے وقت - ۱۸ اکتوبر ۱۹۷۲ء)

اور وہاں کے گورنر، میر غوث بخش بزنجو نے اخبار نویسوں سے بات کرتے ہوئے کہا:۔

چار قومیتوں کے مجموعہ سے ایک پاکستانی قوم بنے گی۔
(نوائے وقت۔ ۱۴ اکتوبر ۱۹۷۲ء)

یہ تھے سُرتوں کے وہ ڈھول جو (بزعم ان کے) دو قومی نظریہ کی ناکامی پر ان صوبوں میں بجائے گئے۔ ہماری نوجوان نسل پر اس پراپیگنڈہ کا جو اثر ہوا اس کا مجھے ذاتی تجربہ ہے۔ یہ طالب علم میرے پاس اکثر آتے رہتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر ایسے تھے جنہیں میں، دو قومی نظریہ کی اصلاحی رسم سمجھاتا چلا آ رہا تھا اور وہ اس کے قائل بھی ہو چکے تھے۔ لیکن مشرقی پاکستان کے بنگالیوں کی علیحدگی اور اس پر ہمارے ان "زعمائے کرام" کے اس قسم کی تنقیدات سے وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ (ان میں سے اکثر) دوبارہ "نیشنلسٹ" ہو گئے اور برملا کہنے لگ گئے کہ یہ نظریہ واقعی غلطی پر مبنی تھا۔

اس کے لئے ہمارے پاس عذر یہ تھا کہ اگر بنگلہ دیش والے سیاسی مفادات کے پیشِ نظر، مغربی پاکستان

سے الگ ہو گئے ہیں تو اس سے دو قومی نظریہ باطل نہیں قرار پا جاتا۔ وہ نظریہ اسلام کی محکم بنیادوں پر استوار ہے۔

یہ داستان تھی پاکستان کی عمارت کے دو نظری ستونوں میں سے ایک ستون کی۔ اب اگر یہاں کے مسلمانوں سے یہ پوچھنا شروع کر دیا گیا کہ تم پاکستان میں اسلامی مملکت قائم کرنا چاہتے ہو یا نہیں، تو باور کیجئے کہ (خاکم بدہن) اس عمارت میں تزلزل ہی واقعہ نہیں ہو گا، یہ سرے سے منہدم ہو جائے گی۔ اس لئے کہ اس الگ مملکت کے قیام کی وجہ جواز ہمارا یہ دعویٰ تھا کہ مسلمان اسلامی نظام قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اگر اب ان سے یہ استصواب کیا گیا تو ساری دنیا پکار اٹھے گی کہ یہ دعویٰ فریب دہی پر مبنی تھا کہ مسلمان اسلامی حکومت چاہتے ہیں۔ اگر یہ یقینی بات تھی تو اب ان سے ایسا پوچھا کیوں جا رہا ہے؟ پوچھا تو اس معاملہ کے متعلق جاتا ہے جس میں کچھ شبہ ہو۔

جب قرارداد پاکستان منظور ہوئی تھی تو مسٹر گاندھی نے کہا تھا:۔

میں پوری جرأت اور جسارت کے ساتھ اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ مسٹر جناحؒ اور ان کے ہم خیال حضرات اپنی اس روش سے اسلام کی کوئی خدمت سرانجام نہیں دے رہے، بلکہ وہ اس پیغام کی غلط ترجمانی کر رہے ہیں، جو فقط اسلام کے اندر پوشیدہ ہے۔ مجھے یہ کہنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ آج کل مسلم لیگ کی طرف سے جو کچھ ہو رہا ہے اس سے میرے دل پر سخت مٹھیس لگ رہی ہے۔ میں اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں کوتاہی کروں گا اگر میں ہندوستان کے مسلمانوں کو اس دروغ بافی سے متنبہ نہ کر دوں جس کا اس نازک وقت میں ان میں پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے۔ (ہندوستان ٹائمز - ۷ اپریل ۱۹۴۰ء)

یہ لوگ کہا کرتے تھے کہ مسٹر جناحؒ جھوٹا پروپیگنڈہ کرتے رہتے ہیں اور انہوں نے اسلام کا غلط تصور پیش کر کے عوام کو اپنے پیچھے لگا لیا ہے۔ رفتہ رفتہ جب حقیقت ان پر کھل جائے گی تو یہ اس کا ساتھ چھوڑ کر پاکستان کے مطالبہ سے دستبردار ہو جائیں گے۔

تقسیم ہند کا فیصلہ کانگریس اور مسلم لیگ کے باہمی سمجھوتے سے ہوا تھا۔ ۳ جون ۱۹۴۷ء کو یہ فیصلہ ہوا اور ۱۴ جون کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے حسب ذیل ریزولیوشن پاس کیا:۔

آل انڈیا کانگریس کو پورا پورا یقین ہے کہ جب موجودہ جذبات کی شدت میں کمی آ جائے گی تو..... ہندوستان کے مسئلہ کا حل صحیح صحیح پس منظر میں دریافت کر لیا جائے گا۔ اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے دو الگ الگ قومیں ہونے کا نظریہ باطل قرار پا جائے گا۔

کانگریس کی طرف سے تقسیم ہند کے فیصلے پر دستخط پنڈت جواہر لعل نہرو نے کئے تھے۔ وہ ایک طرف اس فیصلہ پر دستخط کر رہے تھے اور دوسری طرف اپنی قوم سے کہہ رہے تھے:۔

ہماری سکیم یہ ہے کہ ہم اس وقت جناحؒ کو پاکستان بنا لینے دیں اور اس کے بعد معاشی طور پر یا دیگر انداز سے ایسے حالات پیدا کرتے چلے جائیں جن سے مجبور ہو کر مسلمان گھٹنوں کے بل جھک کر

ہم سے درخواست کریں کہ ہمیں پھر سے ہندوستان میں ضم کر لیجئے۔
(پاکستان فیسز انڈیا۔ صفحہ ۷۹)

ہمارا ملک، اندرونی طور پر جن خدشات اور بیرونی طور پر جن خطرات میں گھرا ہوا ہے ان کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ لے دے کے ایک نظریۂ پاکستان ہے جو ہمارے لئے ایک حد تک، ملّی یک جہتی کا موجب ہے۔ اگر اس میں بھی شکوک و شبہات پیدا کر دیئے گئے تو اس کشتی کا لنگر ٹوٹ جائے گا۔ ہندو اسی انتظار میں ہے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے خاتمہ پر مسٹر چوّن نے کہا تھا کہ

پاکستان اور ہندوستان کے درمیان اسی دن سے مخاصمت کی بنیاد رکھ دی گئی تھی جس دن پاکستان وجود میں آیا تھا۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان آئیڈیالوجی کا اختلاف ہے۔ اس کے سوا کوئی اختلاف نہیں۔ اور یہ اختلاف اور دشمنی مہینے یا ہفتے بھر کی نہیں بلکہ سالہا سال تک رہے گی۔ بھارت کو اس کے لئے ایک تازہ اور فیصلہ کن جنگ کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔

جنگ کی بجائے (یا اس کی تیاریوں کے ساتھ ساتھ) وہ اس کوشش میں ہیں کہ یہ اختلاف ویسے ہی ذہنوں سے مٹ جائے اور اس کی آسان ترین شکل یہ ہے کہ نظریۂ پاکستان کے نقوش مدھم پڑتے جائیں تاآنکہ یہ آنے والی نسلوں کے ذہنوں سے نسیاً منسیا ہو کر رہ جائے۔ اس کے بعد انہیں دبوچ لینا چنداں دشوار نہیں ہوگا۔

ہندو اس تاک میں ہے اور اندرونِ ملک، نیشنلسٹ مسلمان، جنہوں نے خود یا ان کے اکابرین نے قائدِ اعظمؒ کے ہاتھوں شکست کھائی تھی، اس انتظار میں کہ یہ نظریہ کمزور ہو تو وہ اپنی شکست کا بدلہ لے سکیں۔ وہ اس قسم کے خیالات مدّت سے پھیلا رہے ہیں کہ

اصل اسلام تصوّف ہے اور صوفی، مذاہب اور عقائد کی بنیاد پر قومیت استوار کرنے کے خلاف ہے اور مذاہب کے موجودہ تعصبات کو درست نہیں سمجھتا۔ وہ مذہب اور سیاست کو ایک دوسرے سے علیٰحدہ رکھنے کا حامی ہے۔

(جی۔ ایم۔ سیّد کی کتاب "جیسا میں نے دیکھا"۔ آخری صفحہ)

نیشنلسٹ علماءؒ اپنے مقتدر مولانا حسین احمد مدنیؒ کے اس فتوے کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے کہ

ایسی جمہوری حکومت جس میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، سب شامل ہوں، حاصل کرنے کے لئے سب کو متفقہ کوشش کرنی چاہیئے۔ ایسی مشترکہ آزادی اسلام کے اصول کے عین مطابق ہے اور اسلام اس آزادی کی اجازت دیتا ہے (زمزم۔ مورخہ ۷ جولائی ۱۹۳۸ء)

ان سب کے اوپر، پاکستان کی نئی نسل کا تعلیم یافتہ یعنی (حالیہ یا سابق) طالب علموں کا طبقہ ہے جن کی تعداد معلوم کہاں تک پہنچ چکی ہے۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد آج تک، جو کچھ یہاں اسلام کے نام پر ہوا ہے، یہ طبقہ اس سے، نفسِ اسلام سے، نہ صرف برگشتہ بلکہ متنفّر ہو چکا ہے۔ ابھی تک یہ نوجوان اپنے خیالات کا اظہار نجی محفلوں تک محدود رکھتے ہیں اور معاشرہ کے دباؤ کی وجہ سے اعلانیہ ان کا اظہار نہیں کرتے۔ اب اگر آپ نے انہیں خود ہی اس کا موقعہ بہم پہنچا دیا کہ وہ بتائیں کہ

نوجوان طبقہ

وہ اسلامی نظام چاہتے ہیں یا — نہیں (اور نہیں سے مراد ہوگی سیکولر نظام) تو ان کی طرف سے جو جواب آئے گا اس کے لئے کسی منجم سے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ اب آپ سوچئے کہ ملک میں:-

(۱) سابقہ نیشنلسٹ مسلمانوں کا پورا طبقہ موجود ہے جو پاکستان کا دل سے خلاف ہے۔

(۲) کمیونسٹ اور سوشلسٹ موجود ہیں جو سرے سے اسلام ہی کے منکر ہیں۔

(۳) جدید نسل پر مشتمل تعلیم یافتہ اور طالب علم موجود ہیں جو موجودہ اسلام سے متنفر ہو چکے ہیں۔

ان گروہوں سے یہ پوچھنا کہ تم اسلامی نظام چاہتے ہو یا سیکولر نظام، درحقیقت انہیں ان کے ان خیالات کے بلا جھجک اظہار کا موقعہ بہم پہنچا دینا ہے جسے وہ اس وقت بعض مصالح کی بنا پر علانیہ زبان پر نہیں لاتے۔

یہ ہوگا اس مجوّزہ ریفرنڈم کا نتیجہ۔

———— (۰) ————

پچھلے دنوں، ریفرنڈم کے حق میں جو ایک آدھ مضمون میری نظروں سے گذرا ہے، اس میں دلیل یہ دی گئی ہے کہ دنیا کے مختلف ممالک نے اپنے ہاں ریفرنڈم کرائے اور ان کا نتیجہ مفید نکلا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ ریفرنڈم کرائے کن سوالات کا فیصلہ کرانے کے لئے تھے؛ یہ کہ جمہوری نظام، نظام پارلیمانی ہونا چاہیئے یا صدارتی —— ووٹنگ کا طریق یوں ہونا چاہیئے یا دوں —— کبینٹ کے لئے سرکتنی ہونی چاہیئے؛ وقس علیٰ ہذا۔ لیکن یہ دلائل دیتے وقت انہوں نے اتنا نہیں سوچا کہ ان معاملات کا تعلق عقائد سے نہیں دین سے نہیں۔ مسلمان کی اسلامی زندگی سے نہیں۔ اس لئے اس قسم کے ریفرنڈم میں کسی نے یہ کہہ دیا تو کیا اور وہ کہہ دیا تو کیا۔ یا اس کے نتیجہ میں حکومت نے یہ طریق اختیار کرایا تو کیا اور وہ طریق اختیار کر لیا تو کیا۔ لیکن اگر کسی ریفرنڈم میں مسلمانوں سے یہ پوچھا جائے کہ تم مسلمان رہنا چاہتے ہو یا نہیں، تو سوچیئے کہ جو شخص اس کا جواب (معاذ اللہ) نفی میں دے گا، امّت میں اس کا مقام کیا ہوگا۔ وہ اس کے دائرے سے خارج ہو جائے گا۔ آپ شاید کہہ دیں کہ اس کا جواب نفی میں کوئی دے گا ہی نہیں۔ تو سوال یہ ہے کہ پھر اس ریفرنڈم کی ضرورت کیا ہوگی؟

اس نقطہ پر ایک بار پھر غور کیجئے۔ اسلامی نظام اور مسلمان ہونا لازم و ملزوم ہیں۔ یعنی جو شخص اسلامی نظام نہیں چاہتا وہ مسلمان ہی نہیں کہلا سکتا۔ مجوّزہ ریفرنڈم میں جن لوگوں نے کہہ دیا کہ وہ اسلامی نظام نہیں چاہتے تو حکومت کے لئے ضروری ہوگا کہ پہلے طے کرے کہ مملکت میں ایسے لوگوں کی پوزیشن کیا ہوگی؛ ان کی پوزیشن جو ہوگی سو ہوگی خود حکومت جس مخمصہ میں پھنس جائے گی وہ بڑا پریشان کن ہوگا۔ اس سے مملکت میں تین طبقات پیدا ہو جائیں گے۔ یعنی

(۱) غیر مسلم، جن پر ان کے اپنے قوانین کا اطلاق ہوگا۔

(۲) اسلامی نظام کے مؤید مسلمان، جن پر اسلامی قوانین لاگو ہوں گے۔ اور

(۳) اسلامی نظام کے مخالف مسلمان۔ معلوم نہیں ان پر کون سے قوانین کا اطلاق ہوگا!

———— (۰) ————

لیکن اس باب میں ابھی مقطع کا بند باقی ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ ریفرنڈم میں پوچھا یہ جائے گا کہ تم اسلامی نظام چاہتے ہو یا نہیں؟ سوال یہ پیدا ہوگا کہ کونسا اسلامی نظام؟ یہ اُمت، اسلام سے برگشتہ نہیں ہوئی لیکن اسلام کا متعین مفہوم اس کے سامنے نہیں

کونسا اسلامی نظام

اس لئے یہ انتشار اور خلفشار کا شکار ہے۔ یہاں ہر ایک کا اسلام الگ الگ ہے۔ مذہبی فرقوں کا ہی نہیں، غیر مذہبی "دانشوروں" کا بھی جس کے جی میں جو آئے لکھتا چلا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ کہتا چلا جاتا ہے کہ اسلام نے یہ کہا ہے۔ اسلام کی رُو سے ایسا ہے۔ اسلام اسے جائز قرار دیتا ہے۔ یہ اسلام کے خلاف ہے"۔ اور ایسا کہنے میں اس کی قطعاً ضرورت نہیں سمجھتا کہ اپنے دعوے کے ثبوت میں کوئی سند، حوالہ، یا استشہاد پیش کرے ——— اور وہ پیش بھی کیا کرے جب ابھی تک یہی طے نہیں کہ کس خیال، نظریہ، عقیدہ یا مسلک کے اسلامی یا غیر اسلامی قرار دینے کے لئے وہ استشہاد کونسی ہے جو سب کے نزدیک متفق علیہ ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ پنجاب انکوائری کمیٹی نے (عوام سے نہیں) حضرات علماء کرام سے یہ پوچھا تھا کہ مسلمان کسے کہتے ہیں؟ ان میں سے اکثر نے تو اس کا جواب دینے سے معذرت چاہی تھی اور جنہوں نے جواب دیا تھا، ان میں سے کسی ایک کا جواب دوسرے سے نہیں ملتا تھا۔ یہی صورت آجکل لفظ "اسلامی" کی ہے۔ اسلامی حکومت۔ اسلامی نظام۔ اسلامی شریعت۔ اسلامی قوانین وغیرہ الفاظ ہر ایک کی زبان پر ہیں، لیکن کسی کے ذہن میں ان کا کوئی مفہوم نہیں۔ یا یوں کہیئے کہ ہر ایک کے ذہن میں ان کا الگ الگ مفہوم ہے۔

چھوٹے سے پیمانے پر اس کا تجربہ حال ہی میں کیا جا چکا ہے۔ حکومت نے اسلامی قانون (شریعت لا) کی حیثیت سے زکوٰۃ کا آرڈی ننس نافذ کیا تو ایک طرف سے آواز بلند ہوئی کہ یہ اسلامی قانون نہیں۔ ہم اسے تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ نتیجہ یہ کہ حکومت کو نہ صرف اس آواز کے بلند کرنے والوں کو اجازت دینی پڑی کہ وہ اپنے "اسلامی قانون" کے مطابق زکوٰۃ ادا کرتے رہیں بلکہ یہ اجازت عام کرنی پڑی کہ جس کا جی چاہے اپنے "اسلامی قانون" کے مطابق زکوٰۃ ادا کر دے۔ یہ اس لئے کہ آپ نے پہلے طے نہیں کیا تھا کہ کسی قانون کے اسلامی قرار دینے کے لئے معیار (استشہاد) کیا ہے؟ جب ایک قانون کی صورت میں یہ نتیجہ برآمد ہوا ہے تو آپ سوچیئے کہ "اسلامی نظام" (جو مسلمانوں کی پوری کی پوری انفرادی اور اجتماعی زندگی کو محیط ہوگا) اس سلسلہ میں کیا صورت پیدا ہوگی؟ کہنے کو تو ہر ایک کہہ دے گا کہ ہم اسلامی نظام چاہتے ہیں، لیکن جب اس کی عملی تشکیل کا وقت آئے گا تو اس وقت دیکھیئے گا کہ معاشرہ میں کس قسم کے اختلافات پیدا ہوتے اور مفسدات سر اٹھاتے ہیں۔

اگر اُمت کے دل میں کسی وقت صحیح اسلامی نظام کے تابع زندگی بسر کرنے کا جذبہ بیدار ہوا تو اس وقت سب سے مقدم کرنے کا کام یہ ہوگا کہ یہ متعین کیا جائے کہ اسلامی نظام کہتے کسے ہیں اور اس کے لئے استشہاد کیا ہے؟ قائدِ اعظم کو اس کی اہمیت کا پورا پورا احساس تھا۔ اس لئے جب انہوں نے اسلامی نظام، یا اسلامی حکومت کا مطالبہ کیا تو اس اصطلاح کو مبہم اور غیر متعین نہیں رہنے دیا تھا۔ انہوں نے نہایت واضح اور دو ٹوک الفاظ میں بتایا تھا کہ

اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور

وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآنِ مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآنِ کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت، دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

(حیدر آباد دکن کا مشہور انٹرویو)

اور اس کی اتھارٹی قرآن مجید کی بیّن آیات ہیں (جنہیں میں چالیس برس سے پیش کرتا چلا آرہا ہوں)۔ قرآن کی اتھارٹی کے بعد مسلمانوں کے لئے کسی ریفرنڈم کی گنجائش نہیں رہتی۔ ریفرنڈم ان امور کے فیصلہ کرنے کے لئے ہوتا ہے جن میں شک و شبہ ہو اور قرآن اپنا تعارف ان الفاظ میں کراتا ہے کہ

ذَالِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ۔ (۲/۲)

اس کتاب میں شک و شبہ کی کوئی بات نہیں۔

اور یہی تھا قائدِ اعظمؒ کے ذہن میں اسلام کا وہ تصوّر جس کے عملی نفاذ کے لئے انہوں نے پاکستان کا مطالبہ کیا تھا۔ اسی بنا پر وہ پاکستان اور اسلام کو لازم و ملزوم قرار دیتے تھے۔ انہوں نے (تحریکِ پاکستان کے دوران) قوم کو متنبہ کیا تھا کہ

اگر آپ چاہتے ہیں کہ اس ملک سے اسلام کا نام و نشان نہ مٹ جائے تو اس کے لئے پاکستان نہ صرف یہ کہ ایک عملی نصب العین ہے بلکہ یہی اور صرف یہی واحد نصب العین ہے۔ یاد رکھو! اگر ہم اس جدوجہد میں ناکام رہ گئے تو ہم تباہ ہو جائیں گے اور پھر اس برصغیر میں مسلمانوں کا اور اسلام کا نام و نشان تک مٹ جائے گا۔

(تقاریر۔ جلد اوّل ص ۲۶۷۔ جلد دوم۔ ص ۲۵۵)

اس کے بعد بھی کیا یہ امر فیصلہ طلب رہ جاتا ہے کہ پاکستان میں نظام کس قسم کا ہو گا؟

(o)

نوٹ:۔ یہ مقالہ روزنامہ نوائے وقت کی اشاعت بابت ۳ ار فروری سنہ ۱۹۸۱ء میں بھی شائع ہوا تھا لیکن (معلوم کیوں؟) انہوں نے اس کا عنوان از خود بدل کر اس کی جگہ "اسلامی حکومت۔ قرآنی اصولوں اور احکام کی حکمرانی ہے" لکھ دیا تھا۔ اس سے عنوان اور نفسِ مضمون میں کوئی ربط ہی نہ رہا۔ یہ وضاحت بغرضِ رفعِ التباس ضروری سمجھی گئی ہے۔

طلوعِ اسلام کا مقصد و مسلک

(جسے معلوماتِ عامہ کے لئے وقتاً فوقتاً شائع کیا جاتا ہے۔)

(۱) تنہا عقلِ انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت نہیں کر سکتی۔ اسے اپنے رہنمائی کے لئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی ضرورت۔

(۲) خدا کی طرف سے عطا شدہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لئے ابد تک ضابطۂ ہدایت ہے۔ لہٰذا اب نہ خدا کی طرف سے کسی کو وحی مل سکتی ہے نہ کوئی نبی یا رسول آ سکتا ہے۔ قرآنِ کریم خدا کی آخری کتاب اور حضورؐ رسالتمآب خدا کے آخری نبیؐ اور رسول ہیں۔

(۳) قرآنِ کریم کا ہر دعویٰ علم پر مبنی ہے اور اس کے حقائق زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہیں۔ قرآنی حقائق کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ جس حد تک انسانی علم ترقی کر چکا ہے وہ انسان کے سامنے ہو اور چونکہ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے کہ خدا نے تمام کائنات انسان کے لئے تابعِ تسخیر کر رکھی ہے اس لئے خدائی پروگرام کو پورا کرنے

(۴) کے لئے کائناتی قوتوں کی تسخیر ضروری ہے۔

نبیؐ اکرم کی سیرتِ مقدسہ، شرف و عظمتِ انسانیت کی معراجِ کبریٰ ہے۔ یہی وہ پاکیزہ سیرت ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لئے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ) ہے۔ حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کا جو حصہ قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہے اس کے قطعی یا یقینی ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ باقی رہا وہ حصہ جو قرآن سے باہر ہے۔ سو اس میں اگر کوئی بات ایسی ہے جو قرآن کے خلاف جاتی ہے یا جس سے حضورؐ پر (معاذ اللہ) کسی قسم کا طعن پایا جاتا ہے تو ہمارے نزدیک وہ بات غلط ہے۔ اسے حضورؐ کی طرف منسوب نہیں کرنا چاہیئے۔ یہی اصول صحابۂ کبارؓ کی سیرتِ مقدسہ کے سلسلہ میں بھی سامنے رکھا جانا چاہیئے۔

(۵) دین کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسانوں کو دوسرے انسانوں کی محکومی سے چھڑا کر ان سے خالص قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرائے۔ قوانین کی یہ اطاعت ایک نظامِ مملکت کی رو سے ہو سکتی ہے اس کے بغیر دین (جو بنظامِ زندگی کا نام ہے) متمکن نہیں ہو سکتا۔

(۶) رسول اللہؐ نے سب سے پہلے دین کا نظام قائم فرمایا۔ اس نظام میں قرآنِ کریم کے احکام و قوانین کی اطاعت کرائی جاتی تھی اور جن امور میں قرآنِ کریم نے صرف اصول دیئے ہیں ان کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے امورِ مملکت اُمت کے مشورہ سے سرانجام پاتے تھے۔

(۷) رسول اللہؐ کے بعد دین کا وہی نظام حضورؐ کے خلفائے راشدین نے جاری رکھا۔ اس میں امورِ مملکت سرانجام پانے کا وہی طریقہ تھا جو رسول اللہؐ کے زمانہ میں رائج تھا۔ یعنی قرآنِ کریم کے احکام و قوانین کی اطاعت اور جن امور میں قرآنِ کریم نے

طرف اصول دیئے ہیں ان کی پابندی کے اندر اُمت کے مشورہ سے متعلقہ امور کے فیصلے۔ اس طریق کو خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کہا جاتا ہے۔

(۸) بدقسمتی سے خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کا یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے بعد منقطع ہوگیا اور دین کا نظام باقی نہ رہا۔ اس سے اُمت میں انتشار پیدا ہوگیا۔ خلافت کے زمانے میں تمام امور دین کے نظام کے تابع رہتے تھے۔ لیکن اب مذہب اور سیاست میں ثنویت پیدا ہوگئی۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری ہے۔

(۹) ہمارے نئے کام کرنے کا یہ ہے کہ پھر سے خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کا سلسلہ قائم کیا جائے جو اُمت کو احکام و قوانینِ خداوندی کے مطابق چلائے۔ ظاہر ہے کہ اس نظام کو چلانے والوں کی اپنی زندگی سب سے پہلے قوانینِ خداوندی کے تابع ہوگی۔

(۱۰) چونکہ دین کا نظام (خلافت علیٰ منہاجِ رسالت) زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہوگا۔ اس لئے اس میں موجودہ ثنویت ختم ہو جائے گی۔ یعنی اس میں یہ نہیں ہوگا کہ سیاسی معاملات کے لئے حکومت کی طرف رجوع کیا جائے اور مذہبی یا شخصی امور کیلئے مذہبی پیشوائیت کی طرف۔ اس میں یہ دونوں شعبے باہمد گر مدغم ہو جائیں گے۔

(۱۱) جب تک اس قسم کا نظام قائم نہیں ہو جاتا، اُمت کے مختلف فرقے جس جس طریق پر نماز، روزہ وغیرہ اسلامی احکام پر عمل کر رہے ہیں، کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ ان میں کوئی ردّ و بدل کرے یا کوئی نیا طریقہ وضع کر کے اُسے "خدا اور رسول" کا طریقہ قرار دے۔

(۱۲) قرآنی نظام کا مقصود یہ ہے کہ خدا کی متعین کردہ مستقل اقدار کے مطابق انسان کی مقصد صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ نظام تمام افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی، روٹی، کپڑا، مکان، علاج، تعلیم وغیرہ بہم پہنچانے کا ذمہ دار ہو۔

(۱۳) قرآن کا نظام اپنی نوعیت کا واحد اور منفرد نظام ہے اس لئے نہ وہ دنیا کے کسی اور نظام میں جذب ہو سکتا ہے نہ ان سے مفاہمت کر سکتا۔ خواہ وہ مغرب کا جمہوری سرمایہ دارانہ نظام ہو یا سوشلزم کا آمرانہ اشتراکی نظام۔ اس کے نزدیک یہ سب نظام ہائے زندگی غیر خداوندی ہیں لہٰذا باطل۔

(۱۴) جہاں تک احادیث کا تعلق ہے ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآنِ کریم کے مطابق ہو، یا جس سے حضور نبی اکرمؐ یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔

(۱۵) ہم، رسول اللہؐ کے بعد، ہر قسم کے مدعیٔ وحی کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔

(۱۶) طلوعِ اسلام کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے نہ مذہبی فرقہ سے (اسے فرقہ اہلِ قرآن سے بھی کوئی تعلق نہیں)۔ نہ ہی یہ کوئی نیا فرقہ پیدا کرنا چاہتا ہے اس لئے کہ اس کے نزدیک دین میں فرقہ سازی شرک ہے۔ اُمت کے مختلف فرقے جس طریق سے نماز، روزہ وغیرہ کی ادائیگی کرتے ہیں، ہم ان میں کسی قسم کا ردّ و بدل نہیں کرتے۔ اور بلا ردّ و بدل ان کی پابندی کرتے ہیں۔ ہم قرآنِ کریم کی تعلیم کو عام کرتے ہیں تاکہ کسی طرح پھر سے قرآنی نظام (خلافت علیٰ منہاجِ رسالت) کا قیام عمل میں آسکے۔ یہ ہے ہمارا مسلک، جسے ہم برسوں سے دہراتے چلے آرہے ہیں۔ اس کے خلاف جو کچھ ہماری طرف منسوب کیا جاتا ہے، وہ مخالفین کا گمراہ کن پروپیگنڈہ ہے۔

(۰)

بحضورِ شاہنشاہِ بوریہ نشین (صلے اللہ علیہ وسلم)

اسلامی مملکت کے سربراہ کی معاشی ذمہ داریاں

عید میلاد النبیؐ کی تقریب پر خطاب

پرویز

باسمہٖ تعالیٰ

بحضورِ شاہنشاہِ بوریانشینؐ

اسلامی مملکت کے سربراہ کی
معاشی ذمہ داریاں

عصرِ حاضر کا ایک ماہرِ سیاسیات، پروفیسر مینکن (H. J. MENCKEN) دنیا کی سیاسی تاریخ کا جائزہ لینے کے بعد بصد حسرت و یاس اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ

تمام ناکامیوں میں سب سے بڑی ناکامی خود انسان کی ہے۔ اس انسان کی جو سب سے زیادہ مدنی الطبع اور سب سے زیادہ عقل مند ہے۔ اور وہ ناکامی یہ ہے کہ یہ اپنے لئے آج تک کوئی ایسا نظام وضع نہیں کر سکا جسے دور سے بھی اچھی حکومت کہا جا سکے۔ اس نے اس باب میں بڑی بڑی کوششیں کی ہیں۔ بہت سی ایسی جو فی الواقعہ محیر العقول ہیں اور بہت سی ایسی جو بڑی جرأت آزما ہیں لیکن جب ان کے عملی نفاذ کا وقت آیا تو نتیجہ حسرت و یاس کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ نظری طور پر حکومت کا خاکہ کھینچ لینا اور بات ہے اور عملی طور پر اسے نافذ کرنا اور بات۔ نظری طور پر حکومت اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ افرادِ مملکت کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کا ذریعہ ہے اور اربابِ حکومت پبلک کے خادم ہیں لیکن جب حکومت کو عملاً قائم کیا جاتا ہے تو اس کا مقصد عوام کی خدمت کے بجائے انہیں لوٹنا کھسوٹنا ہو جاتا ہے۔ (TREATISE OF RIGHT AND WRONG)

اس مؤرخ نے بے شک اقوامِ عالم کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہوگا لیکن نظر آتا ہے کہ تاریخ کا ایک باب یا تو اس کی نگاہوں سے اوجھل رہا اور یا اس نے اسے عملاً نظر انداز کر دیا۔ اس لئے کہ یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ باب ایک غیر جانبدار مؤرخ کے سامنے آئے اور وہ انسان کی اس کامیابی کا تذکرہ نہ کرے جس کی رُو سے اس نے دنیا کو بتا دیا کہ ایک ایسا نظام قائم کیا جا سکتا ہے جس میں حکومت کا فریضہ عوام کے خادم کی حیثیت سے ان کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنا ہو۔ اور یہ فریضہ محض نظری طور پر اس کے سامنے نہ ہو بلکہ وہ حکومت اسے عملاً پورا کر کے دکھا دے۔ یہ نظام قائم ہوا تھا، آج سے قریب چودہ سو سال

پہلے، محمد رسول اللہ والذین معہٗ کے انسانیت ساز ہاتھوں سے جس سے دنیا نے دیکھ لیا تھا کہ انسان اگر وحی کی راہ نمائی میں اپنا معاشرہ متشکل کرے تو کس طرح اس کی ناکامیاں، کامیابیوں میں بدل جاتی ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ زمانی اعتبار سے اس نظام کی مدت بڑی مختصر سی تھی۔ لیکن جہاں تک اثرانگیزی کا تعلق ہے، دنیا کی کوئی تاریخ بھی اس کے تذکرہ کے بغیر مکمل نہیں سمجھی جاسکتی۔ اس نظام کے متعدد گوشے ہیں جن میں سے ہر گوشہ اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ جو حکومت مستقل اقدارِ خداوندی کی بنیادوں پر قائم ہوتی ہے اس کا ہر قدم کس طرح تعمیرِ انسانیت کے لئے اٹھتا ہے لیکن چونکہ پرویز صاحب نے ان میں سب سے زیادہ اہمیت اس گوشے کو دی ہے جس کا تعلق عوام کی بنیادی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے سے ہے۔ اور ویسے بھی ہمارے اس دور میں معاشیات نے خاص اہمیت اختیار کرلی ہے۔ اسے تو کہا ہی عہدِ اقتصادیات (AGE OF ECONOMICS) جاتا ہے اور کسی نظام کے حسن و قبح کے ماپنے کا پیمانہ ہی یہ قرار پاگیا ہے کہ وہ عوام کی معاشی مشکلات کا حل کیا پیش کرتا ہے۔ اس لئے میں نے مناسب سمجھا ہے کہ عیدِ میلادالنبیؐ کی اس تقریبِ سعید پر خصوصیت سے اس گوشے کو سامنے لاؤں۔ اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جائے گی کہ اسلامی حکومت کے سربراہ کی معاشی ذمہ داریاں کیا ہوتی ہیں اور انہیں پورا کرنے کے لئے وہ کس طرح اپنی زندگی کو بطور نمونہ پیش کرتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ کوئی حکومت بھی تعمیری نتائج پیدا نہیں کرسکتی جب تک اس کے سربراہ ان اصولوں پر خود عمل کرکے نہ دکھائیں جنہیں اس حکومت کی اساس قرار دیا جاتا ہو۔

اسلامی حکومت کا بنیادی اصول

اسلامی حکومت کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا۔ (۱۱/۶)

روئے زمین پر کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو۔

اسلامی حکومت جو خدا کے نام پر لوگوں سے اطاعت لیتی ہے، خدا کی اس ذمہ داری کو پورا کرنے کا عہد کرتی ہے۔ اس لئے وہ افرادِ مملکت سے پوری ذمہ داری کے ساتھ کہتی ہے،

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ (۶/۱۵۲)

ہم تمہاری ضروریاتِ زندگی کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کی ضروریات کے بھی۔

وہ ان میں سے ہر فرد کو اس بات کی ضمانت دیتی ہے کہ

إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرَىٰ ۝ وَأَنَّكَ لَا تَظْمَأُ فِيهَا وَلَا تَضْحَىٰ (۲۰/۱۱۸-۱۱۹)

ہم ایسا جنتی معاشرہ متشکل کریں گے جس میں تمہیں نہ بھوک کی پریشانی ہوگی نہ لباس کی، نہ پیاس کی تکلیف ہوگی، نہ سردی گرمی سے بچنے کی۔ اس میں روٹی، کپڑا اور مکان وغیرہ تمام افراد کو میسر ہوگا۔ اس کی ذمہ داری ہمارے سر پر ہوگی۔

آپ غور کیجئے یہ کتنی عظیم ذمہ داری ہے جسے یہ مملکت اپنے سر پر لیتی ہے۔ اس کے بعد یہ دیکھئے کہ اس گراں بار ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اس مملکت کا سربراہ، اپنی زندگی کس قسم کی بسر کرتا ہے۔ اس مملکت کے سب سے پہلے سربراہ

خود نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم تھے۔

حضورؐ کی مکّی زندگی

آپؐ کی حیاتِ طیبہ کے دو ادوار ہیں۔ ایک مکّی زندگی دوسری مدنی۔ مکّی زندگی میں یہ مملکت قائم نہیں ہوئی تھی۔ لیکن حضورؐ اس جماعت کی تشکیل و ترتیب میں مصروف تھے جس کی رفاقت سے یہ مملکت قائم ہوئی تھی۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ آپؐ کی مکّی زندگی بڑی عسرت اور تنگدستی کی تھی۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ خدا نے حضورؐ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَأَغْنٰى (۹۳/۸) "ہم نے تجھے تنگ دست پایا تو غنی کر دیا"۔ اس سے ظاہر ہے کہ حضورؐ کی وہ زندگی ایک "غنی" کی زندگی تھی۔ یعنی ایسی زندگی جس میں آپؐ کو اپنی ضروریات کے لئے کسی کا محتاج نہیں ہونا پڑتا تھا۔ لیکن وہاں جماعت کے افراد کی ذمہ داریاں بہت زیادہ تھیں۔ ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے سلسلے میں اس وقت حضورؐ کا اسلوب کیا تھا۔ اس کا اندازہ صحیحین کی اس روایت سے لگ سکتا ہے جس میں کہا گیا ہے:۔

> حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ اشعر قبیلہ والوں کے ہاں دستور یہ تھا کہ جب کسی جنگ میں ان کے ہاں کھانا تھوڑا رہ جاتا، یا ان کے ہاں بال بچوں پر دیسے فاقہ کی نوبت آجاتی تو یہ لوگ اپنے اپنے کھانے کی چیزوں کو ایک جگہ جمع کر لیتے اور ایک برتن میں برابر حصے لگا کر آپس میں تقسیم کر لیتے۔
>
> رسول اللہ نے فرمایا کہ یہ لوگ مجھ سے ہیں اور میں ان میں سے ہوں۔

اس سے ظاہر ہے کہ اس زمانے میں حضورؐ اور جماعتِ مومنین کا اندازِ زیست ایسا تھا کہ اپنی اپنی ضروریات کی چیزوں کو سب اکٹھا کر لیتے اور پھر اس میں سے حصہ رسدی لے لیتے۔ چونکہ اس وقت جماعت میں اکثریت محتاجوں اور ناداروں کی تھی، اس لئے ظاہر ہے کہ اس مساواتی تقسیم میں ہر ایک کے حصے میں کس قدر آتا ہوگا، جو کچھ دوسروں کے حصے میں آتا ہوگا، وہی کچھ حضورؐ کے حصے میں آتا ہوگا، بلکہ اس سے بھی کم، اس لئے کہ قرآن کریم نے مومنین کا اندازِ زیست یہ بھی تو بتایا ہے کہ

يُؤْثِرُونَ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (۵۹/۹)

وہ دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دیتے ہیں خواہ انہیں خود تنگی میں ہی گزارا کرنا پڑے۔

اور حضورؐ سب سے پہلے اس پر عمل پیرا ہوتے ہوں گے۔

مدنی زندگی

حضورؐ کی مدنی زندگی میں ایک مملکت وجود میں آگئی۔ آپؐ قریباً دس لاکھ مربع میل پر پھیلی ہوئی سلطنت کے سربراہ تھے۔ مولانا شبلی (مرحوم) کے الفاظ میں:۔

> یہ وہ زمانہ تھا جب تمام عرب، حدودِ شام سے لے کر عدن تک فتح ہو چکا تھا اور مدینہ کی سرزمین میں زرد و سیم

کا سیلاب آچکا تھا۔ (سیرت النبیؐ۔ جلد اوّل۔ صفحات ۵۲-۴۴۹)۔

لیکن اس کے باوجود آپؐ نے جس انداز کی زندگی بسر کی اس کے متعلق کتب تاریخ و سیر میں ہے کہ

> حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپ کا کوئی کپڑا تہ کر کے نہیں رکھا گیا۔ صرف ایک جوڑا ہوتا تھا، دوسرا نہیں ہوتا تھا جو تہ کر کے رکھا جاتا۔ جن کپڑوں میں آپؐ نے وفات پائی ان میں اوپر تلے پیوند لگے ہوئے تھے۔ (ایضاً)

عسرت کی زندگی کیوں؟

اس پر لازماً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اس قدر وسیع علاقہ آپ کے زیر نگیں ہوتا اتنی بڑی سلطنت کے آپؐ سربراہ تھے۔ مدینہ میں زر و سیم کا سیلاب آچکا تھا، تو پھر آپؐ اس قدر عسرت کی زندگی کیوں بسر کرتے تھے؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ مملکت کے وجود میں آجانے سے حضورؐ کی ذمہ داریوں میں بھی تو اسی نسبت سے اضافہ ہو گیا تھا۔ مملکت میں خوشحال لوگوں کی تعداد بہت کم تھی۔ باقی سب مفلوک الحال، ضرورت مند، مفلس اور نادار تھے، جن کی کفالت مملکت کے ذمے تھی۔

دنیا کی عام مملکتوں میں رئیس مملکت یا دیگر ارباب حکومت کے اخراجات کے لئے سب سے پہلے رقم الگ کر لی جاتی ہے اور جو باقی بچتا ہے اس میں سے دیگر مدّات پر صرف کیا جاتا ہے۔ لیکن اسلامی مملکت میں صورت اس کے بالکل برعکس ہوتی ہے۔ اس میں سربراہ مملکت اپنی ضروریات کو سب سے مؤخر رکھتا ہے۔ وہ اس وقت کھاتا ہے

سربراہ سب سے پیچھے

جب سب کھا چکتے ہیں۔ وہ اس وقت پہنتا ہے جب سب پہن چکتے ہیں۔ ابوداؤد کی روایت ہے کہ

> حضورؐ نے فرمایا جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے بعض امور کا نگران بنا دے اور وہ لوگوں کی، ضروریات اور احتیاجات سے لاپرواہی برتے تو اللہ تعالیٰ اس کی ضروریات اور احتیاجات کی طرف سے لاپرواہی برتے گا۔ (ابوداؤد۔ کتاب الخراج)

یہی روایت ترمذی میں ان الفاظ میں آئی ہے:-

> حضورؐ نے فرمایا جو امام ضرورت مندوں، محتاجوں اور مسکینوں پر اپنے دروازے بند کر لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی ضروریات اور احتیاجات کے لئے آسمان کے دروازے بند کر دیتا ہے۔
> (ترمذی۔ کتاب الاحکام)

اس تفصیل کو حضورؐ نے چند الفاظ میں سمٹا کر یوں بیان فرمایا کہ

> جس بستی میں کسی شخص نے اس حال میں صبح کی کہ وہ رات بھر بھوکا رہا، اس بستی سے اللہ تعالیٰ کی نگرانی اور حفاظت کا ذمہ ختم ہو گیا۔ (مسند امام احمد)

کوئی فرد تنہا نہ رہنے پائے

مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ کسی فرد کو محسوس تک نہ ہونے دے کہ وہ تنہا یا لاوارث ہے اس لئے حضورؐ نے فرمایا کہ

> جس کا کوئی سرپرست نہ ہو، اس کا سرپرست اللہ اور اس کا رسول ہے۔
> (ترمذی۔ باب الفرائض)

حتیٰ کہ اگر کوئی شخص ایسی حالت میں وفات پا جائے کہ اس پر کسی کا قرض ہو اور وہ تنگدستی کی وجہ سے اس قرض کو ادا نہ کر سکا ہو تو اس کے قرض کی ادائیگی بھی مملکت کے ذمہ ہوگی۔ حضورؐ نے یہ اعلان فرمایا تھا کہ

میں مسلمانوں سے ان کے اپنے افراد کی نسبت زیادہ قریب ہوں۔ سو ان میں سے جو مقروض وفات پا جائے تو اس کے قرض کی ادائیگی میرے ذمے ہے۔ (ابو عبید۔ کتاب الاموال)

مملکت کی یہ ذمہ داریاں، صرف انسانی تک محدود نہیں، چونکہ قرآن کریم نے کہا ہے کہ "زمین پر کوئی ذی حیات، ایسا نہیں، جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو"۔ اس لئے اسلامی مملکت کے حدود میں رہنے والے ہر متنفس کی ذمہ داری مملکت پر عائد ہوتی ہے۔

ہر متنفس کے رزق کی ذمہ داری

اس لئے حضرت عمرؓ نے جو اسلامی مملکت کے تیسرے سربراہ اور حضورؐ کے جانشین تھے، فرمایا تھا:۔

اگر دجلہ کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مر جائے تو عمرؓ سے اس کی بھی باز پرس ہوگی (ماتوفیق الرحمٰن)

حضرت عمرؓ کے زمانے میں اسلامی مملکت کا رقبہ ساڑھے بائیس لاکھ مربع میل تک پھیل چکا تھا اور ایک عراق کی مال گذاری ساڑھے گیارہ کروڑ درہم تھی۔ لیکن اسی نسبت سے افرادِ مملکت کی تعداد میں بھی اضافہ ہو گیا تھا اور مملکت کی ذمہ داریاں بھی بڑھ گئی تھیں۔ افرادِ مملکت کے رزق کی ذمہ داریاں پوری کرنے کے لئے ضروری ہے کہ وسائلِ پیداوار مملکت کی تحویل میں رہیں۔ وسائلِ پیداوار میں بنیادی حیثیت زمین کو حاصل ہے اور قرآن کریم کی رُو سے زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کا اعلان ہے کہ اَلْاَرْضُ لِلّٰہِ۔ "زمین اللہ کی ہے"۔ اس پر کسی انسان کی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ اسے سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ۔ (۴۱/۱۰) ہر ضرورت مند کی ضرورت پوری کرنے کے لئے کھلا رہنا چاہیئے۔ اس کی تشریح میں حضورؐ نبی اکرمؐ نے اعلان فرمایا کہ

زمین اللہ کی ہے اور بندے بھی اللہ کے ہیں۔ اس لئے اللہ کی زمین اللہ کے بندوں کے لئے کھلی رہنی چاہیئے۔ (ابو داؤد)

اس اعلانِ عظیم کا نتیجہ تھا کہ زمین پر ذاتی ملکیتیں ختم ہو گئیں اور زمیندار اور مزارع کی کوئی تفریق نہ رہی آج کل ہمارے ہاں سود کی بحث نے بڑی اہمیت حاصل کر رکھی ہے۔ لیکن یہ بحثیں بنک کے سود تک محدود ہیں یہ بات کوئی نہیں بتاتا کہ حضورؐ نبی اکرمؐ نے زمین کی بٹائی (مزارعت) کے معاملہ کو بھی سودی کاروبار قرار دیا ہے۔ حضرت ابن ابی نعیمؓ کی روایت ہے:۔

(حضرت) رافع بن خدیجؓ نے ایک زمین کاشت پر لی۔ وہ اس کی آبیاری کر رہے تھے کہ حضورؐ ادھر سے گذرے اور پوچھا کہ یہ کھیتی کس کی ہے، اور زمین کس کی؟ رافعؓ نے کہا کہ یہ کھیتی میرے بیج اور محنت کا نتیجہ ہے اس کا ایک حصہ میرا ہوگا اور ایک حصہ فلاں خاندان کا جس کی یہ زمین ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ تم دونوں سودی کاروبار کر رہے ہو۔ لہٰذا زمین صاحبِ زمین کو واپس کر دو، اور جو کچھ تم نے خرچ کیا ہے اسے اس سے وصول کر لو۔ (ابو داؤد)

ایک اور روایت میں اس اصول کی مزید تشریح ان الفاظ میں آئی ہے:۔

رسول اللہؐ سے سوال کیا گیا کہ کیا زمین کا مالک کاشتکار سے تھوڑا بہت اناج بھی نہیں لے سکتا؟ فرمایا

نہیں۔ پھر سوال کیا گیا اچھا نقد نہ سہی، معجوسہ تو لے سکتا ہے؟ فرمایا۔ بالکل نہیں۔ (نسائی)
اس لئے کہ جب زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت ہو ہی نہیں سکتی تو حقِ ملکیت کیسا؟ زمین خدا کی اور اس میں پیداوار کے تمام اسباب و عناصر بھی اس کے عطا کردہ۔ پھر یہ بیں کا "خود ساختہ" مالک کس بات کا معاوضہ لیتا ہے؟ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون ! کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار خاک یہ کس کی ہے، کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب؟

دہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں، میری نہیں!
تیرے آبا کی نہیں، میری نہیں، تیری نہیں!

"زمین کے مالک اور مزارع" کا سوال تو ایک طرف رہا، وہ حضرات اس باب میں اس قدر محتاط تھے کہ حضرت عمرؓ کے بیٹے حضرت عبداللہؓ کا بیان ہے کہ "میں نے کچھ اونٹ خریدے اور انہیں سرکاری چراگاہ میں بھیج دیا۔ وہ فربہ ہو گئے تو انہیں بازار میں فروخت کرنے کے لئے آیا۔ اتفاق سے حضرت عمرؓ کا گزر اس طرف سے ہوا۔ انہوں نے پوچھا کہ ایسے فربہ اونٹ کس کے ہیں؟ میں نے جواب دیا تو پوچھا کہ یہ ایسے موٹے تازے کس طرح ہو گئے ہیں؟ میں نے کہا کہ میں نے انہیں سرکاری چراگاہ میں بھیج دیا تھا تاکہ جو فائدہ دوسرے مسلمان اٹھاتے ہیں، میں بھی اٹھاؤں۔
یہ سن کر آپؓ کو سخت غصہ آیا اور کہا کہ عام مسلمانوں کا ذکر کیوں کرتے ہو! کہو امیر المؤمنین کے بیٹے کے اونٹ تھے اس لئے حکومت کی چراگاہ میں بھیج دیئے۔ سنو! اونٹ فروخت کرو اور راس المال رکھ کر منافع بیت المال میں جمع کرا دو۔ (شاہکارِ رسالت۔ صفحہ ۳۳۱)
یہ تو خلیفہ کے بیٹے کی بات تھی۔ خود خلیفہ بیت المال میں اپنا حصہ کس قدر سمجھتا تھا، اس کے متعلق جب حضرت عمرؓ سے پوچھا گیا، تو آپؓ نے فرمایا:۔

خلیفہ کا حصہ

کپڑوں کے دو جوڑے، ایک جاڑے کا اور دوسرا گرمی کا، حج اور عمرہ کے لئے ایک احرام، اور میرے اور میرے اہل و عیال کے لئے قوت بس اتنا کھانا جو قریش کے ایک آدمی کی خوراک ہے، نہ اس سے زیادہ نہ اس سے کم، اس کے بعد میں مسلمانوں کا ایک فرد ہوں، جو اُن کا حال سو میرا حال۔

(عمر فاروقؓ۔ از محمد حسین ہیکل)

وہ فرمایا کرتے تھے کہ
اللہ کا مال میرے لئے ایسا ہے جیسے کسی یتیم کا مال، ضرورت نہیں ہوتی تو اسے ہاتھ نہیں لگاتا اور حاجتمند ہوتا ہوں تو بقدرِ احتیاج لے لیتا ہوں۔ (ایضاً)

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا وظیفہ

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا فیصلہ اس سے زیادہ ایمان افروز ہے۔ وہ کپڑے کی تجارت کیا کرتے تھے۔ جب آپؓ خلیفہ منتخب ہوئے تو حضرت عمرؓ نے ان سے کہا کہ

آپ کا سارا وقت ملت کا ہو گیا ہے، آپ اسے اپنی ذاتی ضروریات کے لئے صرف نہیں کر سکتے۔ اس پر سوال پیدا ہوا کہ پھر خلیفہ اور اس کے اہل وعیال کی ضرورت پوری کرنے کا کیا ذریعہ ہو گا؟ طے ہوا کہ خلیفہ بقدرِ کفاف بیت المال سے وظیفہ لے سکتا ہے۔ اس فیصلے کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ خلیفہ کا وظیفہ کس قدر ہونا چاہیئے، مختلف تجاویز پیش ہوئیں، لیکن حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ اس کا فیصلہ وہ خود کریں گے۔

آپ کو معلوم ہے کہ انہوں نے اس کا تعین کس طرح سے کیا؟ انہوں نے کہا کہ دریافت کرو کہ مدینہ میں ایک مزدور کی کم از کم اُجرت کس قدر ہے، جس قدر اس کی اُجرت تھی، آپؓ نے اُسی قدر اپنا وظیفہ مقرر کیا۔ رفقاء نے کہا کہ اس میں آپ کا گزارہ کس طرح ہو سکے گا؟ فرمایا جس طرح اس مزدور کا گزارہ ہوتا ہے۔ اگر اس میں میرا گزارہ نہیں ہو گا تو میں مزدور کی اُجرت بڑھا دوں گا تاکہ اسی نسبت سے میرے وظیفہ میں اضافہ ہو جائے۔ آپؓ نے فرمایا کہ میرے نزدیک اصول یہ ہونا چاہیئے کہ خلیفہ کا وظیفہ مملکت کے کم از کم آمدنی والے محنت کش کے برابر ہو" تاکہ اسے احساس ہو کہ اس آمدنی میں غریب کس طرح گزارہ کرتے ہیں اور پھر اس احساس کے تابع وہ افرادِ مملکت کی آمدنی میں اضافہ کرنے کی تدابیر اختیار کرے"۔ (شاہکار رسالت ص۵۹)

ترکِ دُنیا نہیں

اس مقام پر میں اس حقیقت کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ وہ جو موٹے کپڑے اور روکھا سوکھا کھانا اس لئے نہیں تھا کہ یہ حضرات تارک الدنیا زاہدوں کی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے۔ اس قسم کے زہد و تورع کے متعلق ان کا ردِ عمل یہ تھا کہ

ایک دن حضرت عمرؓ نے کسی زاہد مرتاض کو دیکھا۔ اس کے پاس گئے اور ایک درہ مار کر بولے:۔
"خدا تجھے موت دے، ہمارے دین کا کیوں گلا گھونٹتا ہے؟" (ہیکل)

جیسا کہ میں نے اوپر بتایا ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے اپنا اصول یہ بنا لیا تھا کہ مملکت کا سربراہ اپنا معیارِ زندگی ایسا رکھے جو اُمت کے ہر فرد کو میسر آ سکتا ہو، جوں جوں اُمت کے عام معیارِ زندگی کی سطح بلند ہوتی جائے سربراہِ مملکت کا معیار بھی اونچا ہوتا چلا جائے، چنانچہ تاریخ میں ہمیں یہ واقعہ بھی ملتا ہے کہ ایک دفعہ مصر کا گورنر آیا تو حضرت عمرؓ کھانا کھا رہے تھے۔ اس نے دیکھا کہ کھانے میں جَو کی روٹی ہے۔ اس نے کہا کہ اب تو مصر

جَو کی روٹی

سے کافی مقدار میں گیہوں آ رہا ہے، آپ گیہوں کی روٹی کیوں نہیں کھاتے؟ آپؓ نے فرمایا کہ اس کا مجھے یقین ہے کہ اس وقت مملکت میں ہر فرد کو جَو کی روٹی میسر آ رہی ہے جس دن آپ مجھے اس کا یقین دلا دیں گے کہ ہر فرد کو گیہوں کی روٹی مل رہی ہے اس دن میں گیہوں کی روٹی کھاؤں گا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ مملکت میں ایک بھی فرد ایسا ہو جسے گیہوں کی روٹی میسر آتی ہو، اور سربراہِ مملکت گیہوں کی روٹی کھائے۔ جب آپ سے کہا گیا کہ آپ اس قدر عسرت کی زندگی بسر کر کے اپنے آپ کو مشقت میں کیوں ڈال لیتے ہیں؟ تو آپ نے اس کا جو جواب دیا وہ اسلامی مملکت کے سربراہ کے احساسِ ذمہ داری کا صحیح آئینہ دار ہے، آپ نے فرمایا کہ

میں رعایا کی دیکھ بھال کیسے کر سکتا ہوں جب تک مجھ پر وہی کچھ نہ بیتے جو رعایا پر بیتتی ہے۔

(ہیکل)

جب آذربائیجان کا علاقہ فتح ہوا تو جیوشِ اسلامیہ کے سپہ سالار حضرت عقبہ بن فرقدؓ نے وہاں کی ایک خاص مٹھائی کے دو ٹوکرے امیر المؤمنین حضرت عمرؓ کی خدمت میں بھیجے۔ آپؓ نے مٹھائی کو چکھا تو بہت پسند فرمایا۔ لیکن اسے کھانے سے پہلے قاصد سے پوچھا کہ اس مٹھائی کو وہاں تمام سپاہیوں نے کھایا ہے؟ قاصد نے جواب دیا کہ نہیں! یہ تو صرف آپؓ کے لئے ہے۔ اس پر آپؓ نے عقبہ کو جو خط لکھا وہ ہمارے پیشِ نظر نکتہ کی بہترین تفسیر ہے۔ آپؓ نے لکھا:-

> اللہ کے بندے، امیر المؤمنین کی طرف سے عقبہ بن فرقدؓ کے نام۔ امابعد۔ فرقد! تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ جو کچھ ہمیں اللہ نے عطا کیا ہے وہ نہ تمہاری ذاتی محنت اور مشقت کا نتیجہ ہے نہ تمہارے ماں باپ کی محنت اور مشقت کا نتیجہ (یہ تمام مسلمانوں کی مشترکہ محنت کا ثمر ہے) اس لئے ہم کوئی چیز ایسی نہیں کھا سکتے جو تمام مسلمانوں کے گھروں میں کافی مقدار میں نہ ہو۔ (شاہکارِ رسالت)

قادسیہ کی عظیم فتح کی خوشخبری سننے کے بعد، آپؓ نے جو خطبہ ارشاد فرمایا، تاریخ کے صفحات پر آج تک سنہری حروف میں درخشندہ ہے۔ آپؓ نے کہا:-

> مجھے اس بات کی بڑی فکر رہتی ہے کہ جہاں بھی کسی کو ضرورت مند دیکھوں، اس کی ضرورت پوری کر دوں۔ جب تک ایک دوسرے کی (انفرادی طور پر) مدد کرنے سے ایسا ہو سکے، ہمیں ایسا کرنا چاہیئے جب معاملہ اس سے آگے بڑھ جائے تو ہمیں سب کو مل کر گزر اوقات کرنی چاہیئے۔ یہاں تک کہ سب کا معیارِ زندگی ایک جیسا ہو جائے۔ کاش! تم جان سکتے کہ میرے دل میں تمہارا کس قدر خیال ہے۔ لیکن یہ چیز میرے زبانی سمجھانے کی نہیں۔ عمل کر کے دکھانے کی ہے۔ خدا کی قسم! میں بادشاہ نہیں کہ تم لوگوں کو اپنا محکوم اور غلام بنا کر رکھوں۔ میں تو خود خدا کا محکوم اور غلام ہوں۔ حکمرانی کی یہ امانت میرے سپرد کی گئی ہے۔ اب اگر میں اسے اپنی ذاتی ملکیت نہ سمجھ لوں، بلکہ تمہاری چیز تمہاری طرف لوٹا دوں، اور تمہارے پیچھے تمہاری خدمت کے لئے چلوں یہاں تک کہ تم اپنے اپنے گھروں میں سیر ہو کر کھا پی سکو، تو یہ وہ سعادت ہو گی جو تمہارے ذریعہ مجھے میسر آجائے گی۔ لیکن اگر میں اس امانت کو اپنا لوں اور تمہیں اپنے پیچھے پیچھے چلنے اور اپنے گھر پر آنے کے لئے مجبور کر دوں، تو یہ وہ بدبختی ہو گی جو تمہارے ذریعے میرے سر پر مسلط ہو جائے گی۔ (خدا مجھے اس سے محفوظ رکھے)"۔
>
> (شاہکارِ رسالت)

یہ تو پھر بھی مٹھائی تھی، جب حجاز میں قحط پڑا تو حالات بڑے نازک ہو گئے تھے اور آپؓ کی ضبطِ خویش اور خود فراموشی کی شدت انتہا تک پہنچ گئی تھی۔ اسی زمانے کا ذکر ہے کہ ایک دن آپؓ نے دیکھا آپؓ کا پوتا ککڑی

عمرؓ کا پوتا پھل کھا رہا ہے

(یا تر بوز) کھا رہا ہے۔ (حضرت) عبداللہ بن عمرؓ کو بلایا اور ڈانٹ کر کہا کہ "محمدؐ کی اُمت بھوکی مر رہی ہے اور عمرؓ کا پوتا پھل کھا رہا ہے"؟ بیٹے نے کہا کہ ابا جان! خفا نہ ہو جیئے۔ عمرؓ کے پوتے کو "پھل" کسی خصوصی امتیاز کی بنا پر نہیں ملا۔ صبح کے ناشتے میں بچوں کو جو کھجوریں ملی تھیں، اس نے ایک بدو لڑکے سے ان کے عوض یہ ککڑی (یا تربوز) خرید لیا تھا۔

یہ عمرؓ کی پوتی تھی!

ایک دن گلی میں دیکھا کہ ایک بچی جا رہی ہے — زرد رُو، نحیف و نزار — اُسے دیکھ کر آپؓ کو بڑا صدمہ ہوا۔ پوچھا، یہ کس کی بچی ہے؟ بیٹا ساتھ تھا۔ کہا کہ "یہ امیرالمؤمنین کی پوتی ہے!" فرمایا کہ "اس کی ایسی حالت کیوں ہے؟" کہا کہ "اس قحط میں جو ملتا ہے، بدّوؤں کے بچے تو اس کے عادی ہیں لیکن ہمارے بچے اس کے عادی نہیں۔ اس لئے ان کی یہ حالت ہو رہی ہے۔ فرمایا کہ "حالت کچھ بھی ہو، اس عالمگیر مصیبت میں کسی کے ساتھ ترجیحی سلوک نہیں کیا جا سکتا۔"

ہم نے شروع میں بتایا ہے کہ اسلامی مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ تمام افرادِ مملکت کی ضروریاتِ زندگی پوری ہوتی رہیں۔ اس کے لئے مختلف تدابیر اختیار کی جاتی تھیں۔ لیکن احتیاط یہ برتی جاتی تھی کہ کسی شخص کو اپنی ضروریت کے لئے (اور تو اور، خود) خلیفہ کے سامنے بھی ہاتھ نہ پھیلانا پڑے، کیونکہ اس سے صاحبِ احتیاج کی عزتِ نفس کے مجروح ہونے کا اندیشہ تھا۔ اس حقیقت سے مملکت کا ہر فرد واقف تھا۔ اور کس حد تک واقف تھا، اس کے لئے ایک ایسا واقعہ سامنے آتا ہے کہ خود حضرت عمرؓ بھی جب اسے یاد کرتے تھے تو ان کی آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے۔

شام کے ویرانے کی بڑھیا

آپؓ شام کے سفر سے واپس آرہے تھے تو راستے میں ایک خیمہ دیکھا — ویرانے میں ایک خیمہ! قریب گئے۔ تو دیکھا کہ اس میں ایک بڑھیا بیٹھی ہے۔ اس سے پوچھا کہ "تمہیں عمرؓ کا بھی کچھ حال معلوم ہے؟" اس نے کہا کہ "سنا ہے کہ وہ شام سے چل پڑا ہے۔ اس سے زیادہ نہ مجھے اس کی بابت کچھ علم ہے، نہ معلوم کرنے کی ضرورت۔" آپؓ نے پوچھا کہ "ایسا کیوں؟" اس نے کہا کہ "جس نے آج تک یہ معلوم نہیں کیا کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے، میں اس کے حالات معلوم کر کے کیا کروں گی؟" آپؓ نے کہا کہ "تم نے عمرؓ تک اپنی حالت کی اطلاع پہنچائی تھی؟" اس نے کہا کہ "یہ میرا کام نہیں تھا، عمرؓ کا کام تھا۔" آپؓ نے کہا کہ "عمرؓ کو اتنی دُور کا حال کیسے معلوم ہو سکتا ہے؟" اس کے جواب میں اس بڑھیا نے جو کچھ کہا وہ غور سے سننے کے قابل ہے۔ اس نے کہا کہ

اگر عمرؓ اپنی رعایا کے ہر فرد کے حالات کا علم نہیں رکھتا تو اسے حکومت کرنے کا کیا حق حاصل ہے۔

حضرت عمرؓ جب بھی اس واقعہ کو یاد کرتے تو آنکھوں میں آنسو آجاتے اور کہتے کہ خلافت کا مفہوم کیا ہے، مجھے شام کی اس بڑھیا نے بتایا۔ ؎

خداوندا! خدائی دردِ سر ہے

اسی کا احساس تھا کہ آپؓ نے ایک دفعہ فرمایا کہ

اگر میں زندہ رہا تو رعایا کا حال معلوم کرنے کے لئے سال بھر تک مسلسل سفر میں رہوں گا — کیونکہ

> دور دراز علاقوں کے لوگ مجھ تک پہنچ نہیں سکتے۔ اور میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے عمّال ان میں سے ہر ایک کی ضروریات سے مجھے آگاہ کرتے ہوں۔ میں شام، جزیرہ، مصر، بحرین، بصرہ جاؤں گا اور ہر مقام پر دو دو ماہ قیام کر کے لوگوں کے حالات براہِ راست معلوم کروں گا۔

لیکن عمرؓ نے الفانہ کی، اور اس دورہ کا موقع ہی نہ ملا۔

اگر یہ پوچھا جائے کہ قرآن کے اس معاشی نظام کی یہ عظیم عمارت کن بنیادوں پر استوار تھی جس کی عاجبانہ اور عدیم النظیر مثالیں اس شاہنشاہِ بوریہ نشینؐ اور آپ کے رفقائے کرامؓ کی زندگی سے پیش کی گئی ہیں تو اس کا جواب دو لفظوں میں دیا جا سکتا ہے کہ یہ عمارت عدل و احسان کی بنیادوں پر استوار تھی۔ عدل و احسان کے درخشندہ اصول کو ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ کسی حوض میں چشمہ اُبلتا ہے۔ جب حوض بھر جاتا ہے تو اس کا زائد پانی باہر نکلنا شروع ہو جاتا ہے۔ یہ پانی کس طرف جاتا ہے؟ نشیب کی طرف۔ یعنی اس نچلی سطح کی طرف جہاں پانی نہیں ہوتا۔ جب وہ گڑھے بھی بھر جاتے ہیں تو پانی آگے جانا شروع ہو جاتا ہے۔ حوض کا اپنی گنجائش کے مطابق پانی رکھ لینا عدل ہے اور فالتو پانی کو ان گڑھوں کی طرف منتقل کر دینا، جہاں اس کی ضرورت ہے، احسان ہے۔ اس طرح حوض اور اس کے گرد و پیش میں پانی کا (LEVEL) ہموار ہو جاتا ہے۔ یہ ہے اسلام کا معاشی نظام جس میں امیر اور غریب کے طبقات ختم ہو جاتے ہیں اور انسانیت کی سطح ہموار ہو جاتی ہے۔ امیر اور غریب کے طبقات تو زمانہ نزولِ قرآن میں بھی موجود تھے لیکن انہوں نے اس زمانے میں ایسی عالمگیر حیثیت اختیار نہیں کی تھی جیسی اس دور میں ہو چکی ہے۔ بایں ہمہ حضورؐ کی نگہ بصیرت نے اس حقیقت کو اس زمانے میں دیکھ لیا تھا کہ اگر یہ خلیج وسیع ہو گئی تو اس سے کس قسم کے خطرات نمودار ہوں گے۔ اسے حضورؐ نے ایک مثال کے ذریعے سمجھایا۔ فرمایا:-

> کچھ لوگ ایک کشتی میں سوار ہوئے۔ اُن میں سے کچھ اُوپر کے حصّے میں پہنچ گئے، کچھ نیچے کے حصّے میں۔ جو نچلے حصّہ میں تھے، وہ پانی پینے کے لئے اُوپر گئے۔ اوپر والوں نے انہیں یہ کہہ کر پانی لینے سے روک دیا کہ اس سے انہیں تکلیف ہوتی ہے۔ نیچے والوں نے کہا، بہت اچھا۔ ہم نیچے سوراخ کر کے پانی حاصل کریں گے۔ اب اگر ان نیچے والوں کو (پانی دے کر) اس سے روکا نہ گیا تو ظاہر ہے کہ اوپر اور نیچے والے سب غرق ہو جائیں گے۔ اگر روک دیا گیا تو سب بچ جائیں گے۔
>
> (ترمذی جلد دوم۔ الجواب فتن)

حضورؐ نے جس خطرہ سے چودہ سو سال پہلے متنبہ کیا تھا وہ اس دور میں بڑی تیزی سے نمودار ہوتا نظر آرہا ہے۔
فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ؟

(۰)

ہم بات یہ کر رہے تھے کہ قرآن کے معاشی نظام کی عمارت "عدل و احسان" کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔ یعنی ضرورت سے زائد اُس طرف لوٹا دیا جائے، جس طرف اس کی کمی ہے۔ قرآنِ کریم نے اس عظیم اصول کو ایک مختصر سی آیت میں سمو دیا ہے جب کہا کہ وَيَسْــَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹) "اے رسول! یہ تجھ

سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دوسروں کی ضروریات کے لئے دے دیں۔ ان سے کہو کہ جس قدر تمہاری اپنی ضروریات سے زائد ہے، وہ سب کا سب"۔ حوض نے فالتو پانی رکھنا کاہے کے لئے ہے؟ اس نظام میں زائد از ضرورت کسی کے پاس رہتا ہی نہیں مسلم کی ایک روایت سے اس ارشادِ خداوندی کی عملی تفسیر یوں سامنے آتی ہے:۔

حضرت ابوسعیدؓ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ کے ساتھ سفر میں تھے۔ ایک شخص آیا اور دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ آپؐ نے فرمایا کہ جس کے پاس سواری ضرورت سے زائد ہو وہ اس آدمی کو دے دے جسے اس کی ضرورت ہو۔ جس کے پاس زادِ راہ زیادہ ہو وہ اسے دے دے جس کے پاس زادِ راہ نہ ہو۔ اس طرح آپؐ نے بہت سی چیزوں کا ذکر فرمایا حتیٰ کہ ہم نے سمجھ لیا کہ ہم میں سے کسی کو بھی ضرورت سے زائد کوئی چیز رکھنے کا حق نہیں۔

مسلم ہی کی ایک اور روایت ہے:۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ بندہ، میرا مال، میرا مال کہتا ہے۔ حالانکہ مال میں اس کا حصہ صرف تین چیزیں ہوتی ہیں۔ (۱) جو کچھ وہ کھا کر ہضم کر لیتا ہے۔ (۲) جسے وہ پہن کر پرانا کر دیتا ہے اور (۳) جو کچھ دوسروں کی پرورش کے لئے دے کر اپنے لئے ذخیرۂ آخرت کر لیتا ہے۔ ان تین چیزوں کے علاوہ جو کچھ بھی ہوتا ہے، وہ یا تو چلا جاتا ہے۔ یا وہ اسے دوسروں کے لئے چھوڑ کر مر جاتا ہے۔

یہیں سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن کریم نے جو مال و دولت کو جمع کرنے سے سختی سے روکا ہے تو یہ اصول، اسلامی مملکت کے نظام میں کس طرح فٹ بیٹھتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے:۔

مال و دولت جمع نہیں کئے جا سکتے

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۙ (۹/۳۴)

جو لوگ چاندی سونا (مال و دولت) جمع کر کے رکھتے ہیں اور اسے اللہ تعالیٰ کے راستے میں (ضرورتمند کی ضرورت رفع کرنے کے لئے) کھلا نہیں رکھتے تو انہیں الم انگیز عذاب سے آگاہ کر دے۔

اسلامی مملکت میں:۔

(۱) تمام افرادِ مملکت کی ضروریاتِ زندگی کا پورا کرنا مملکت کا فریضہ ہوتا ہے۔

(۲) مملکت کا یہ فریضہ اس طرح پورا ہوتا ہے کہ ہر فرد کاسب (یعنی جو کمانے قابل ہو) پوری پوری محنت سے کمائے۔ اس میں سے اپنی ضروریات کے مطابق رکھ کر باقی مملکت کے لئے کھلا چھوڑ دے تاکہ وہ اسے ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کے کام میں لائے۔

(۳) اس اصول پر سب سے پہلے خود رئیسِ مملکت کاربند ہوتا ہے۔ اور اس کا طرزِ عمل دوسروں کے لئے نمونہ بنتا ہے۔

(۰)

حضورؐ کا ترکہ

اس سے ایک اور حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے اور وہ یہ کہ جب اصول یہ ٹھہرا کہ کوئی شخص اپنی ضروریات سے زائد اپنے پاس رکھ نہیں سکتا۔ تو ایسے معاشرہ میں جائدادیں کھڑی کرتے اور انہیں ترکہ میں چھوڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے حضورؐ نے واضح الفاظ میں فرما دیا تھا کہ

میرے ورثہ میں ایک دینار بھی بطور ترکہ تقسیم نہیں ہوگا۔ میری بیویوں کی ضروریات اور منتظم کی ضروریات کے بعد جو کچھ بھی بچے صدقہ ہوگا۔ (بخاری)

اس سلسلے کی اگلی کڑی وہ روایت ہے جس میں کہا گیا ہے کہ مرض الموت کے ایام میں حضورؐ کے پاس سات دینار تھے اور حضورؐ فرماتے تھے کہ انہیں صدقہ کر دو۔ لیکن اس کے بعد حضورؐ پر غشی طاری ہو گئی، اور سب لوگ آپؐ کی تیمارداری میں مصروف ہو گئے۔ آپؐ کو ہوش آیا تو فرمایا:۔

وہ دینار لے آؤ، دینار کو حضورؐ نے اپنے ہاتھ پر رکھ کر کہا کہ محمدؐ کا اپنے رب پر کیا گمان ہوگا، جبکہ وہ اپنے رب سے ملے اور اس کے پاس یہ ہوں۔ پھر حضورؐ نے انہیں خود صدقہ کر دیا (یعنی بیت المال میں بھیج دیا)

(اصح السیر۔ حکیم دانا پوری)

مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ آنحضرتؐ نے نہ درہم چھوڑا نہ دینار، نہ بکری نہ اونٹ اور نہ کسی چیز کی وصیت کی۔

اسی طرح بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہؐ نے اپنی وفات کے وقت نہ دینار چھوڑا نہ درہم، نہ غلام نہ لونڈی اور نہ کوئی اور چیز سوائے اپنے خچر کے اور اپنے ہتھیار کے۔ اور اس زمین کے جسے آپؐ نے صدقہ کر دیا تھا۔ مولانا شبلی (مرحوم) نے "سیرۃ النبیؐ" میں "متروکات" کے عنوان کا آغاز ہی ان الفاظ سے کیا ہے:۔

آنحضرتؐ نے جب انتقال فرمایا تو اپنے مقبوضات اور جائداد میں سے کیا کیا چیزیں ترکہ میں چھوڑیں؟ اس سوال کا اصل جواب تو یہ ہے کہ آپؐ اپنی زندگی میں اپنے پاس کیا رکھتے تھے جو وفات کے بعد چھوڑ جاتے۔ اگر کچھ تھا بھی تو اس کے متعلق عام اعلان فرما چکے تھے کہ ہمارا کوئی وارث نہیں جو چھوڑا وہ عام مسلمانوں کا حق ہے۔

میں نے ایک نوجوان طالب علم سے جب یہ اصول بیان کیا کہ کوئی شخص اپنی ضروریات سے زائد اپنے پاس کچھ نہیں رکھے گا تو اس نے کچھ طنزیہ انداز سے کہا کہ انسان اپنی ضروریات کا تو سلسلہ ختم نہیں ہوتا۔ اس کا تعین کون کرے گا کہ فلاں کے پاس زائد از ضرورت ہے۔ میں نے نہایت سکون سے جواب دیا کہ اس کا تعین وہ خود کرے گا۔ وہ کیسے کرے گا، سنو!

اسلامی مملکت کے سربراہ، حضرت صدیق اکبرؓ نے ایک دن کھانے کے بعد بیوی سے کہا کوئی میٹھی چیز اگر ہو تو دیجئے۔ اس نے کہا بیت المال سے جو راشن آتا ہے، اس میں میٹھی چیز شامل نہیں ——— بات آئی گئی ہو گئی۔ ہفتہ عشرہ کے بعد آپؓ نے دیکھا کہ کھانے کے ساتھ تھوڑا سا حلوہ بھی ہے۔ آپؓ نے بیوی سے کہا کہ تم نے تو کہا تھا کہ راشن میں کوئی میٹھی چیز

نہیں آتی یہ حلوہ کیسے پک گیا؟ اس نے کہا: "میں ان دنوں مٹھی بھر آٹا الگ رکھتی گئی۔ جب وہ کافی ہو گیا تو اس کے عوض بازار سے کھجور کا شیرہ منگوا لیا اور حلوہ پکا لیا۔" آپؓ کھانا کھانے سے فارغ ہو کر سیدھے بیت المال گئے، اور راشن بانٹنے والے سے کہا کہ ہمارے لئے روزانہ جس قدر آٹا جاتا ہے، اس میں ایک مٹھی کی کمی کر دی جائے کیونکہ تجربہ نے بتایا ہے کہ آٹے کی موجودہ مقدار ہماری روزانہ ضرورت سے بقدر ایک مٹھی کے زیادہ ہے۔"

ہمیں یہ باتیں آج افسانہ سی نظر آتی ہیں۔ لیکن یہ افسانے نہیں، حقیقتیں ہیں۔ جب دین کے تقاضے اعماقِ قلب سے اُبھریں تو اس میں یہ سب کچھ ممکن ہو جاتا ہے۔ دین کا قیام انہی افراد کے ہاتھوں عمل میں آسکتا ہے جن کی ذات میں اس قسم کا تغیر آچکا اور جن کے قلب و نگاہ میں ایسی تبدیلی پیدا ہو چکی ہو۔ نگاہ کی تبدیلی سے انسانی کیریکٹر میں کس قسم کی تبدیلی آجاتی ہے اس کی مثالوں سے ہمارے اُس دور کی تاریخ بھری پڑی ہے جب مدائن فتح ہوا تو فوج کے سپاہی وہاں سے شہنشاہِ ایران کے سونیوں کے ہار، جواہرات کا مرصع تاج اور زرکار ریشمی ملبوسات لے کر آئے جن میں جواہرات ٹکے ہوئے تھے۔

جب اس مالِ غنیمت کا خمس (پانچواں حصہ) مدینہ پہنچا تو اہلِ مدینہ کی آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی تھیں، ان کا ذہن اسے باور نہیں کرتا تھا۔ ساٹھ مربع گز کا تو صرف ایک قالین تھا جس پر مملکت کا نقشہ بنا ہوا تھا۔ اس کی زمین سونے کی تھی جا بجا موتیوں کی نہریں تھیں۔ کناروں پہ چمنستان تھا جس پہ منقوش درختوں کے تنے سونے کے، پتے ریشم کے اور پھل جواہرات کے تھے۔ حضرت سعدؓ نے لکھا تھا کہ یہ تمام زر و جواہرات مسلمان سپاہیوں کے قبضے میں تھے اور ایسے ایسے مقامات سے ملے تھے جہاں انہیں کوئی دیکھنے والا نہیں تھا لیکن ان میں سے کسی نے ایک سوئی بھی اپنے پاس نہیں رکھی۔ سب کچھ لا کر اپنے قائد کے سامنے رکھ دیا۔ یہ معلوم ہونے پر حضرت عمرؓ نے کہا کہ اس کی قسم کی دیانت اور امانت کی مثال اور کہاں مل سکے گی؟ اس کے جواب میں جو کچھ حضرت علیؓ نے فرمایا اس دیانت اور امانت کا راز اس میں تھا۔ آپؓ نے فرمایا کہ

> چونکہ آپؓ کا دامن پاک ہے، اس لئے آپ کی دعا بھی پاک دامن ہے۔ اگر آپ کی نیت ٹھیک نہ ہوتی تو اس کی نیت میں بھی فرق آجاتا۔ (بحوالہ سیکل)

اس دیانت اور امانت کی ابتدا خود اپنے گھر سے ہوتی تھی۔ حضرت معیقیبؓ بیت المال کے خزانچی تھے۔ ایک دن بیت المال میں جھاڑو دینے لگے تو کوڑے میں سے ایک درہم (یوں سمجھئے کہ اس وقت کا چھوٹے سے چھوٹا سکہ) ہاتھ لگا۔ اتفاق سے حضرت عمرؓ کے گھر کا ایک بچہ پاس کھڑا تھا۔ خزانچی نے وہ درہم اس بچے کو دے دیا اور گھر چلا گیا۔ ابھی گھر پہنچا ہی تھا کہ حضرت فاروقِ اعظمؓ کا بلاوا آگیا۔ وہ آیا تو دیکھا کہ وہی درہم آپؓ کے ہاتھ میں تھا۔ کہا کہ معیقیبؓ! میں نے تمہارے ساتھ کونسی زیادتی کی تھی جو تم نے مجھ سے اس طرح بدلہ لینا چاہا؟ تم سوچو کہ قیامت کے دن جب اُمتِ محمدیہ مجھ سے اس درہم کی بابت پوچھے گی تو میں کیا جواب دوں گا؟

آپؓ کا معمول تھا کہ جب لوگوں کو کسی بات سے منع کرتے تو اپنے گھر والوں کو جمع کر کے، ان سے کہتے:۔

> میں نے لوگوں کو فلاں فلاں چیز سے منع کیا ہے۔ یاد رکھو! لوگ تمہاری طرف اس طرح دیکھ رہے ہیں جس طرح پرندہ گوشت کی طرف دیکھتا ہے۔ اگر تم بچو گے تو وہ بچیں گے اور اگر تم پھنسو گے تو وہ

بھی پھنسیں گے۔ اگر تم میں سے کسی شخص نے ان باتوں کا ارتکاب کیا تو خدا کی قسم! میں اپنے ساتھ تمہارے تعلق کی وجہ سے تمہیں دوگنی سزا دوں گا۔ اب تمہیں اختیار ہے جو چاہے حدود سے تجاوز کرے، جو چاہے ان کے اندر رہے۔ (شاہکارِ رسالت)

—(۰)—

یہ ہیں چند ایک جھلکیاں سربراہانِ مملکتِ اسلامی (محمد رسول اللہ والذین معہٗ) کی اس سیرتِ مقدسہ کی جو دنیا کے اربابِ فکر و عمل کو پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ اگر تم انسانیت کی سطح بلند کرنا چاہتے ہو تو اس کا طریق یہ ہے کہ تم نوعِ انسان کے بوجھ کو اپنے کندھوں پر اٹھا کر کھڑے ہو جاؤ اور اپنی سیرت و کردار کو بلند کرتے جاؤ۔ اس طرح جس قدر تم خود بلند ہوتے جاؤ گے اسی نسبت سے انسانیت اوپر کو اٹھتی چلی جائے گی۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف اقبالؒ نے یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ ؎

بوریا ممنونِ خوابِ راحتش
تختِ کسریٰ زیرِ پائے امتش

اس شہنشاہِ بوریا نشینؐ کی حیاتِ طیبہ کا ایک ایک درخشندہ نقش، جہانِ کشورکشائی و فرمانروائی کے اس عظیم راز کی پردہ کشائی کرتا ہے کہ جو صاحبِ ہمت اس بارِ امانت کو اٹھائے، وہ خود تخت کے اوپر نہ بیٹھے۔ تخت کے اوپر قوم کو بٹھائے اور اس کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھا کر، اس کی سطح کو بلند کرتا جائے۔ لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ قرآن کی پیش کردہ مستقل اقدار پر انسان کا اٹل ایمان ہو، اور وہ زندگی کے اس نقشہ کو اپنا نصب العین قرار دے جسے محمد رسول اللہ والذین معہٗ کے مقدس ہاتھوں نے عملاً مرتب کر کے دکھایا تھا۔ جس دن دنیا نے اس راز کو پا لیا اور اس ماڈل کو اپنا مطلوب و مقصود قرار دے لیا۔ یہ جہنم، جس میں اس وقت ساری دنیا مبتلائے عذاب ہے، جنتِ ارضی سے بدل جائے گا اور زمین سر اٹھا کر آسمان سے کہہ سکے گی کہ

دیدہ آغازم۔ انجامم نگر!

اور عالمِ ملکوت کی نور پاش فضاؤں سے، تبریک و تہنیت کے یہ نغماتِ جانفزا، ساکنانِ ارض کے فردوسِ گوش بنیں گے کہ
إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (۳۳/۵۶)

—(۰)—

اس ضمن میں اس حقیقت کو بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ اسلامی مملکت کی یہ ذمہ داری صرف اپنی مملکت کے افراد تک محدود نہیں۔ اس کا دائرہ بڑا وسیع ہے۔ اور تمام عالمِ انسانیت کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہے۔ "اپنی مملکت" تو وہ معمل (لیبارٹری) ہوتی ہے جس میں سب سے پہلے اس نظام کو عمل میں لایا جاتا ہے۔ جوں جوں ان افرادِ مملکت کی ضروریات پوری ہوتی چلی جاتی ہیں عالمگیر ربوبیت کے دائرے کی حدیں آگے بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ اس کا منتہیٰ پوری کی پوری نوعِ انسانی کی پرورش اور نشوونما ہے۔ اس سلسلہ میں انسان اور انسان میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ یہ فرق تو دورِ حاضر کی قومیت پرستی ——— نیشنلزم کی لعنت کا پیدا کردہ ہے جس نے انسانوں کو، خودساختہ معیاروں کے مطابق مختلف ٹکڑوں میں تقسیم کر کے دنیا کو بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ کا الم انگیز جہنم بنا رکھا ہے۔ اسلامی نظام

عالمگیر ربوبیت

اس تفریق کو مٹانے کے لئے وجود میں آئے۔ جس نظام کے سربراہ کا یہ اعلان ہو کہ "اگر دجلہ کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مر گیا تو اس کی ذمہ داری عمرؓ کے سر ہوگی"۔ اس نظام میں یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ جو شخص بھوک سے کراہ رہا ہے وہ اپنی مملکت کا باشندہ ہے یا کسی دوسری مملکت کا۔ وہ اپنی قوم کا فرد ہے یا غیر قوم کا۔ وہ کالا ہے یا گورا۔ وہ عربی ہے یا عجمی۔ وہ مسلمان ہے یا کافر! اس نظام میں اس کی قطعاً تمیز نہیں کی جائیگی۔ اس میں انسان اور انسان میں کوئی فرق نہیں کیا جائیگا۔

نوعِ انسان کی طرف رسولؐ

یہی وجہ ہے کہ اس نظام کے لانے والے رسولؐ کا خطاب نہ کسی خاص خطۂ زمین کے لوگوں سے تھا، نہ کسی خاص قبیلہ، نسل یا قوم کے افراد سے۔ اس کا خطاب پوری نوعِ انسانی سے تھا جب اس نے کہا تھا کہ

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا (۷/۱۵۸)

اے نوعِ انسان! میں تم سب کی طرف خدا کا پیامبر ہوں۔

اور اسی جہت سے اس رسولؐ کو بھیجنے والے خدا نے اعلان کر دیا تھا کہ

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ (۲۱/۱۰۷)

ہم نے تجھے اقوامِ عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

رحمت کے معنی ہیں سامانِ نشوونما جو بلا مزد و معاوضہ دیا جائے ——— اور "نشوونما" میں انسان کی جسمانی پرورش اور اس کی انسانی صلاحیتوں کی تربیت اور ارتقاء سب آجاتے ہیں۔ لہٰذا حضورؐ کے ظہورِ قدسی کا مقصد یہ تھا کہ عالمگیر انسانیت کی اس طرح نشوونما ہو جائے کہ صحنِ چمنِ عالم میں کوئی غنچہ بن کھلے مرجھا نہ جائے۔ اسی رحمۃ اللعالمینی کا تقاضا تھا جس کی وجہ سے آپؐ نے روم کے شہنشاہ کو لکھا تھا کہ

> اگر تم نے صحیح راستہ اختیار نہ کیا تو تمہاری مملکت میں مظلوم کاشتکاروں پر جو زیادتیاں ہو رہی ہیں اس کا سارا بار تمہاری گردن پر ہوگا۔ اور ہم پر یہ فرض ہو جائے گا کہ ان مظلوموں کو اس ظلم سے بچائیں۔

ہزار ہزار بار سلام و رحمت ہو نوعِ انسانی کے اس محسنِ اعظمؐ پر، جس نے اپنی عدیم النظیر تعلیم اور فقید المثال عمل سے دنیا کو بتا دیا کہ جو شخص انسانوں کے معاملات سنوارنے کی ذمہ داری اپنے اوپر لے، اس کی اپنی زندگی کیسی ہونی چاہیئے۔ یہی وہ حیاتِ طیبہ ہے جس کے نقوش، زندگی کی شاہراہ پر، تابندہ ستاروں طرح جگمگ جگمگ کرتے اور کاروانِ انسانیت کو اس کی منزلِ مقصود کا سراغ دیتے ہیں۔ زمانے کی ریگِ رواں پر اگر یہ نقوشِ قدم نہ ہوں تو کوئی راہرو اپنی منزل تک نہ پہنچ سکے۔

ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو — چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو خم بھی نہ ہو — بزمِ توحید بھی دنیا میں نہ ہو تم بھی نہ ہو

خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
بزمِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

پرویز

تحریکِ پاکستان کی کہانی

(طلوعِ اسلام کی زبانی)

قسطِ اوّل

جیسا کہ ان صفحات میں متعدد بار لکھا جا چکا ہے، یہ ہماری ساری قوم کی بدقسمتی، اور نئی نسل کی حرماں نصیبی ہے کہ آج تک نہ تو تحریکِ پاکستان کی کوئی قابلِ اعتماد تاریخ مرتب ہوئی ہے اور نہ ہی قائدِ اعظمؒ کے سوانحِ حیات ہی منضبط۔ اور غور کیجئے تو یہ دونوں دراصل ایک ہی حقیقت کے دو گوشے اور ایک ہی سکہ کے دو رخ ہیں۔ یہ کام حکومتی سطح پر کسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (تحقیقاتی ادارہ) کے کرنے کا تھا لیکن ہمارا نوجوان طبقہ بری طرح گمراہ کن پراپیگنڈہ کا شکار ہو رہا ہے، اس بنا پر کہیں ڈر ہے کہ، تا تریاق از عراق آوردہ شود، مار گزیدہ مردہ شود۔ ہم اس حقیقت کا بھی اظہار کر چکے ہیں کہ جب بھی تحریکِ پاکستان کی تاریخ لکھی گئی اس کی اساس و بنیاد (نظریۂ پاکستان) کے نقطۂ نگاہ سے اس کے لئے بہترین مواد طلوعِ اسلام کے فائلوں ہی سے مل سکے گا۔ اس لئے کہ ایک تو اس تحریک کے اوّلین ایام میں، یہی ایک مجلہ تھا جو قومیت پرست طبقہ (بالخصوص نیشنلسٹ علماء) کے خلاف کھلی ہوئی لڑائی لڑ رہا تھا، اور دوسرے یہ کہ اس کے اجراء کا جذبۂ محرکہ ہی نظریۂ پاکستان کا تحفظ اور فروغ تھا۔ قائدِ اعظمؒ نے یہ محاذ خصوصیت کے ساتھ اس کے سپرد کیا تھا۔ بنا بریں، ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ اس ضمن میں طلوعِ اسلام نے جو کچھ کیا تھا، اس کے کچھ نمایاں خط و خال قارئین کے سامنے لائے جائیں۔ اس سے اس کشمکش کی ایک خفیف سی جھلک، ہماری نئی نسل کے لئے، وجہ فروغِ دیدہ ہو جائے گی۔

تشکیلِ پاکستان کے بعد، طلوعِ اسلام کا پہلا شمارہ (جو جنوری فروری کا مشترکہ پرچہ تھا) فروری ۱۹۴۸ء میں منصۂ شہود پر آیا۔ اس میں ہم نے تشکیلِ پاکستان کے پس منظر کو دو چار فصلوں میں، مختصراً پیش کیا تھا۔ اس کی قسطِ اوّل میں یہ بتایا گیا تھا کہ اس تحریک کے نظریاتی محاذ پر طلوعِ اسلام نے کیا کیا تھا۔ چونکہ تحریکِ پاکستان کی بنیاد ہی ایک نظریہ پر تھی اور خود اس مملکت کا وجود اسی نظریہ کا رہینِ منت تھا، اس لئے اس تحریک کے نظریاتی گوشے کو خاص اہمیت حاصل تھی اور یہی وجہ تھی جو ہم نے اس روئداد کی قسطِ اوّل اسی گوشے کو قرار دیا تھا۔۔۔

اشاعتِ حاضرہ میں، اس قسط کو ہدیۂ قارئین کیا جاتا ہے۔

اس روئداد سے دو باتیں اُبھر کر آپ کے سامنے آئیں گی۔ ایک یہ کہ جس نصب العین کو سامنے رکھ کر طلوعِ اسلام کا اجراء عمل میں آیا تھا (اور جسے اس کے سب سے پہلے پرچہ کے افتتاحیہ میں اپریل ۱۹۳۸ء میں تفصیل سے بیان کر دیا گیا تھا) یہ مجلہ آج تک اسی روش پر گامزن ہے، اور اس کا ہر قدم اسی نصب العین کی طرف اٹھ رہا ہے۔ یہ صرف اس لئے کہ یہ نصب العین، قرآنِ کریم کے ابدی اور غیر متبدل حقائق کا متعین کردہ ہے۔ اور دوسری بات یہ کہ پاکستان کے ایک نظریاتی (یعنی اسلامی) مملکت ہونے کا دعویٰ، کوئی بعد کی اختراع (AFTER THOUGHT) نہیں اس مطالبہ کی بنیاد ہی اس دعویٰ پر رکھی گئی تھی اور اسے، بہ تکرار و اصرار، اس شدت کے ساتھ، بہ بانگِ دہل پکارا اور دہرایا گیا تھا کہ ہندوستان کا بچہ بچہ اس سے واقف اور آشنا ہو گیا تھا۔ یہی وہ دعویٰ ہے جسے اب طلوعِ اسلام مسلسل دہرائے چلا آ رہا ہے۔

اس تعارف کے بعد، ہم تحریکِ پاکستان کی کہانی کا نظریاتی گوشہ پیش کرتے ہیں۔ اسے پھر دہرا دیا جائے کہ یہ روئداد طلوعِ اسلام بابت جنوری، فروری ۱۹۴۸ء کے افتتاحیہ سے ماخوذ ہے — وَاللّٰہُ الْمُسْتَعَانُ۔

(٭)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پس منظر

(لمعات جنوری، فروری ۱۹۴۸ء)

حکایتِ قدِ آں یار دل نواز کنم
بایں فسانہ مگر عمرِ خود دراز کنم

زندگی ایک جوئے رواں ہے۔ مسلسل و غیر منقطع اور حرکتِ پیہم اس تسلسلِ دوام کی ذمہ دار۔ خارجی دنیا میں حوادث و وقائع کی کڑیوں کا باہمی ربط، شاہدِ زندگی کے گیسوئے تابدار کے لئے وجہ تزئین، اور داخلی دنیا میں افکار و تخیلات کا نظم و ضبط، لیلائے وقت کے کاکلِ پیچدار کے لئے باعثِ تحسین۔ اگر خارجی دنیا میں ربط و تسلسل قائم نہ رہے تو تمام شیرازۂ ہستی بکھر جائے اور اگر فکرِ انسانی میں نظم و ضبط باقی نہ رہے تو اس ذہنی انتشار کا نام پاگل پن قرار پا جائے۔ طلوعِ اسلام کا نصب العین زندگی کے حقائق

کو پیش کرتا ہے۔ لہٰذا، اس کے لئے تسلسلِ فکر نہایت ضروری ہے۔ اپریل ۱۹۳۸ء میں اس کا پہلا پرچہ سامنے آیا اور جب تک یہ شائع ہوتا رہا، یہ ایک ہی نصب العین کی طرف دعوت دیتا رہا۔ وہی نصب العین جسے قرآن نے صراطِ مستقیم کہہ کر پکارا ہے۔ راستہ اور سیدھا راستہ۔ راستے کی ضرورت اس کے لئے ہے جو چل رہا ہو۔ جو بیٹھ جائے اس کے لئے راستہ کا وجود اور عدمِ وجود برابر ہے۔ اور راستے کا سیدھا ہونا اس کے لئے مفید جس کی منزل متعین ہو۔ جس کے سامنے کوئی منزل نہیں اس کے لئے راستہ کی کوج و استقامت (ٹیڑھاپن اور سیدھائی) کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا، بالفاظِ دیگر طلوعِ اسلام کی دعوت، تعینِ منزل (ایمان) اور حرکتِ پیہم (عمل) کی دعوت تھی۔ ۱۹۴۲ء سے اس دعوت کا سلسلہ عارضی طور پر رک گیا اور آج بفضلِ ایزدی اس کا پھر اجرا ہو گیا۔ لہٰذا جہاں ہم آج کھڑے ہیں، اس سے پیچھے دو دور و ترلیں اور تھیں۔ ایک (۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۲ء تک) اس کا دورِ اشاعت۔ اور دوسری منزل (۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۷ء) تک کا دورِ التوا۔ افکار میں تسلسل قائم رکھنے کے لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جن راہوں سے اپنے دورِ اوّل میں گزرا ہے ان کے اطراف و جوانب پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال لی جائے تاکہ وہ تمام نقوش جو مرورِ وقت اور اس کے عارضی التوا کی وجہ سے کچھ دھندلے سے پڑ گئے ہیں، اجاگر ہو جائیں۔ اور پھر ان حوادث و ماجرات پر بھی ایک سرسری سی نگاہ ڈال لی جائے جو اس کے زمانہ تعطل میں واقع ہوئے تاکہ آگے بڑھنے سے پیشتر، ماضی سے ہمارا رشتہ استوار ہو جائے اور ہمارے تسلسلِ ذہنی میں کوئی خلا نہ رہے۔ اس نگہ بازگشت سے ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہو گا کہ اس طرح ہماری جنگِ آزادی کے اس دور کی تاریخ ہمارے سامنے آجائے گی جو آنے والے مؤرخ کے نزدیک مسلمانانِ ہند کی زندگی کا اہم ترین دور ہے۔

(۰)

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، طلوعِ اسلام کا پہلا پرچہ اپریل ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔ اس کی اشاعت سے مقصود کیا تھا اس کا اندازہ اس افتتاحیہ سے لگ سکتا ہے جس سے اس کی اشاعت کی ابتدا ہوئی۔

افتتاحیہ دورِ اوّل (۱۹۳۸ء)

"ایک کمزور و ناتواں، غریب و نادار بھکاری کی یہ حالت تھی کہ بیچارہ صبح سے شام تک ایک ایک شخص کے سامنے دستِ سوال دراز کرتا، ہر ایک دروازے پر جھولی پھیلاتا تو بمشکل اتنا پاتا کہ اس سے اپنا پیٹ پال سکے۔ کبھی اتنا بھی نہ پاتا تو فاقہ کاٹتا۔ اس کی ساری عمر یونہی بسر ہو گئی۔ وہ مرتے وقت وصیت کر گیا کہ اسے اس کی جھونپڑی میں ہی دفن کر دیا جائے۔ جب اس کی قبر کھودی گئی، تو لوگ کیا دیکھتے ہیں کہ نیچے پرانے وقتوں کا ایک گراں بہا خزانہ مدفون ہے۔ بھکاری کی تباہ حال زندگی اور یہ خزانہ لوگوں کے لئے عبرت و موعظت کی بڑی داستانیں اپنے اندر رکھتا تھا۔

بھکاری اور خزانہ کا واقعہ حقیقت ہو یا افسانہ، لیکن کیا یہ حقیقت نہیں کہ آج مسلمان کی بھی یہی حالت ہو رہی ہے۔ اس نے دنیا میں اپنے آپ کو سب سے نادار، ہر ایک کا دست نگر سمجھ رکھا ہے اور نہیں جانتا

کہ اس کے پاس ایک ایسا خزانہ موجود ہے جو اسے ساری دنیا سے بے نیاز کر دے۔

بھکاری کے دکھ کا علاج اسے ایک پیسہ خدا کی راہ میں دے دینا یا اس کی طرف روٹی کا ٹکڑا پھینک دینا نہ تھا، بلکہ اس کی حقیقی مدد یہ تھی کہ کسی اللہ کے بندے کو معلوم ہوتا تو اسے اس کے خزانے کا پتہ دے دیتا۔ آج مسلمان کی مصیبتوں کا مداوا بھی یہی ہے کہ اسے اس کے چھپے ہوئے خزانہ سے روشناس کرا دیا جائے جو اس کی خستہ سامانیوں کو سرفرازیوں اور سربلندیوں میں بدل دے۔ یہ متاعِ گراں بہا قرآنِ کریم ہے جو ایک عرصہ سے مسلمان کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے اور اب یہ اتنا بھی نہیں جانتا کہ اس کے اندر ہے کیا؟

آپ کہیں گے کہ مسلمان قرآنِ کریم کی تلاوت کرتے ہیں، اس کے ترجمے سنتے ہیں، تفسیروں کا درس دیا جاتا ہے، اس کی اشاعت کرتے ہیں۔ اور کیا چاہیئے؟ لیکن اگر آپ غور سے دیکھیں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ اس سے زیادہ سے زیادہ قرآن کی حفاظت یا اس کے ساتھ مسلمانوں کی عقیدت قائم رکھنے کا مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن محض حفاظت اور عقیدت تو مقصود بالذات نہیں۔ قرآنِ کریم کے متعلق مسلمانوں کا دعویٰ ہے، اور یہ دعویٰ خود قرآنِ کریم ہی پر مبنی ہے کہ خدائے حیّ و قیوم کی یہ زندہ و پائندہ کتاب ایک مکمل دستور العمل، ایک بہترین ضابطۂ حیات ہے جو مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبہ میں ان کے لئے خضرِ راہ ہے۔ مسلمان کی تو زندگی ہی اس میں تھی کہ وہ ہر قدم اٹھانے سے پیشتر اس امر کا جائزہ لے کہ وہ اپنا قدم اسی جادۂ مستقیم پر لئے جا رہا ہے جسے قرآنِ کریم نے دنیا اور آخرت کی سرفرازیاں حاصل کرنے کا واحد ذریعہ قرار دیا ہے۔ مسلمانوں کی مدنیت و عمرانیت، معاش و معاشرت، مذہب و سیاست، غرضیکہ ہر مسئلہ حیات کا حل اسی ایک نظام کی رُو سے ہونا چاہیئے۔ اس کے تمام افکار و تخیلات، اس کے تمام رجحاناتِ قلبی و ذہنی، اس کے تمام تصوراتِ دینی و دنیاوی سب کی تشکیل اسی ایک سانچے میں ہونی چاہیئے۔ اس کے پاس حقائق کے پرکھنے کا معیار ہو تو یہی۔ اور صداقتوں کے ماپنے کا پیمانہ ہو تو یہی۔ یہ سنے تو اس کی مدد سے، دیکھے تو اس کی روشنی میں، سمجھے تو اس کی بصیرت سے، اور اس طرح یہ اس ایک دروازے پر جھک کر ساری دنیا کے دروازوں سے مستغنی وار، بے نیاز گزرتا جائے۔

آپ جس مسلمان سے پوچھئے وہ بلا تکلف کہہ دے گا کہ الحمد للہ، میرا بھی یہی ایمان ہے۔ لیکن کیا آج ہو بھی یہی رہا ہے؟ کیا مسلمانوں کی زندگی کا عملی حل قرآنِ کریم ہی سے تلاش کیا جاتا ہے؟ کیا ان کا دستور العملِ حیات و اقعی خدا کا یہ آخری پیغام ہے؟

اس کا جواب اپنے گرد و پیش نظر دوڑا کر خود اپنے آپ سے لیجئے۔

لیکن اس تصویر کا اس سے بھی بھیانک پہلو ایک اور ہے۔ یہ حفاظت و عقیدت کی بنیاد پر قرآنِ کریم سے لگاؤ کونسے مسلمانوں کو ہے۔ کیا انہی کو نہیں جو اب، قصۂ ماضی بننے والے ہیں۔ لیکن ذرا اس طبقہ پر نگاہ ڈالیئے جو کل کو اُمّتِ مسلمہ، ملّتِ اسلامیہ کہلانے والا ہے۔ یعنی آج کے نوجوانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ۔ جانے والے مسلمانوں نے اس فضا میں پرورش پائی جہاں پھر بھی کچھ نہ کچھ مذہب کا چرچا تھا۔ لیکن یہ آنے والے مسلمان اس ماحول کے تربیت یافتہ ہیں جہاں اور سب کچھ ہے لیکن خدا اور رسولؐ کا ذکر نہیں۔ ذرا کسی نوجوان مسلمان تعلیم یافتہ کے مکان پر جایئے، دنیا بھر کا لٹریچر اس کی الماریوں میں ملے گا۔ لیکن اگر نہیں ملے گا تو قرآنِ کریم کا نسخہ۔ وہ اپنے بچوں

کو بڑے فخر سے آپ کے سامنے لائے گا۔ یہ بتانے کے لئے کہ اتنی سی عمر میں یہ کس طرح فرفر انگریزی بولتے ہیں۔ یہ قابلِ تحسین بات ہے۔ لیکن اگر آپ پوچھ بیٹھیں کہ بٹیا کلمہ بھی آتا ہے؟ تو وہ آپ کا منہ تکتے رہ جائیں گے کہ یہ کس دیس کی بولی بولتا ہے!

پھر آپ ان کی درسگاہوں میں جائیے اور دیکھئے کہ وہاں مذہب سے بیگانگی نہیں بلکہ نفرت پیدا کرنے کے کس قدر سامان موجود ہیں۔ نتیجہ ان تمام اثرات کا یہ ہے کہ آپ کی قوم کے نوجوان، مسلمانوں کا سا نام تو رکھتے ہیں کہ اس پر انہیں اختیار نہ تھا (اور اب تو نام کو بھی اس انداز سے مروڑتے ہیں کہ اس سے شناخت ہی نہ ہو سکے کہ آپ کس ملت سے متعلق ہیں)۔ لیکن ان کے قلب و دماغ کی تعمیر یکسر غیر اسلامی بنیادوں پر ہوتی ہے۔ جو ذرا متین و سنجیدہ ہوں گے وہ دل ہی دل میں مذہب کے خلاف آتش خاموش سلگاتے رہیں گے۔ جو بزعمِ خویش آزاد قسم کے ہوں گے وہ اعلانیہ تمسخر اڑائیں گے، پھبتیاں کسیں گے اور سمجھیں گے کہ وہ بہت بڑا جہاد کر رہے ہیں۔

لیکن یہ ان کا قصور نہیں، سب قصور ہمارا ہے کہ ایک طرف ہم نے انہیں مذہب سے ناآشنا رکھا اور دوسری طرف ان کو تعلیم اس نہج پر دلائی جس میں مذہب کے خلاف سرکشی کے تمام سامان موجود تھے اور جہاں کہیں مذہب کی تعلیم کا انتظام بھی کیا وہ اس انداز کا تھا کہ اس سے ان کی بیگانگی الٹی نفرت سے بدل جائے۔

لیکن ذرا تصور میں لائیے اس وقت کو کہ جب آپ نہ ہوں گے اور انہی نوجوانوں کی جماعت کا نام مسلمانوں کی قوم ہوگا۔ مفادِ اسلامی کے تحفظ کے لئے آپ کی ہر کوشش لائقِ صد تحسین۔ لیکن سوچئے تو سہی کہ جن کی خاطر آپ یہ تحفظ کے سامان پیدا کر رہے ہیں، ان کی نگاہ میں آپ کے اسلام اور اس کے مفاد کی کوئی وقعت بھی ہے! غور فرمائیے کہ کہیں آپ اس نیام کی نگہداشت میں تو مصروف نہیں جس کے اندر تلوار لکڑی کی ہے؟

بایں ہمہ نوجوانوں سے مایوس ہو جانے کی بھی کوئی وجہ نہیں۔ ایسے نوجوان بہت کم ملیں گے جنہیں اگر صحیح اسلام سے روشناس کرا دیا جائے تو پھر بھی وہ اپنی لادینی پر مصر ہوں۔ یہ ہماری ہی کوتاہی ہے کہ آنے والی قوم اسلام سے متنفر ہو رہی ہے۔

یہ تھے وہ خیالات جنہوں نے پچھلے دنوں چند صاحبِ ہمت درد مند مسلمانوں کے ایک مختصر سے حلقہ کو دعوتِ غور و فکر دی۔ جن کی اکثریت نوجوانوں ہی پر مشتمل تھی۔ وہ کافی غور و تدبر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ بڑی بڑی سکیموں، شاندار پروگراموں، ہنگامہ انگیز تحریکوں کو چھوڑ دیجئے۔ وقت آ گیا ہے کہ قرآنِ کریم کے الفاظ میں "ایک ایک دو دو کر کے ہی خدا کے لئے اٹھ کھڑے ہو" ـــــ پھر سوچو کہ ہمیں کیا کرنا ہے"۔ تجویز یہ ہوئی کہ مسلمان کو اُس کی متاعِ گم گشتہ، اس کے چھپے ہوئے خزانہ سے روشناس کرانے کے لئے کچھ کیا جائے۔ اس کا پہلا قدم یہ ہو کہ ایک ماہوار مجلّہ شائع کیا جائے جو ملّتِ اسلامیہ کی حیاتِ اجتماعیہ کا نقیب ہو۔ اور ان کی ملی زندگی کے ہر مسئلہ کا حل قرآنِ کریم کی روشنی میں پیش کرے، اور نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ پر یہ حقیقت واضح کر سکے کہ قرآنِ کریم کوئی ایسی کتاب نہیں جسے ہم دورِ حاضرہ کی چمکتی ہوئی تہذیب اور دمکتے ہوئے فلسفہ کے سامنے لانے سے شرمائیں۔ بلکہ یہ کہ انسان علم و عقل کی جن بلندیوں تک جا سکے، اُڑ کر چلا جائے۔ خدا کا یہ پیغامِ ازلی وہاں سے بھی دس قدم

آگے ہی نظر آئے گا اور جب ساری دنیا کی یہ حالت ہو جائے گی کہ ؎

تھک تھکا کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے

اس وقت تمام دنیا میں امن و امان قائم کرنے کے لئے، عدمِ سکون و فقدانِ اطمینان کی اس آگ کو فرو کرنے کے لئے جس کے شعلوں میں آج انسانیت یوں لپٹ رہی ہے۔ وہی نظام کارفرما ہوگا جو قرآن کی دفتین کے اندر محفوظ ہے اور جس کے سوا اور کوئی نظام فطرتِ انسانی کے مطابق نہیں ہو سکتا کہ یہ نظام خود خالقِ فطرت کا متعین فرمودہ ہے۔

پھر خدا کے اس پیغامِ ازلی کو پیش کرنے والے حضرات ایسے ہوں کہ جن کی انگلیاں ملتِ اسلامیہ کی نبض پر اور جن کی نگاہیں رفتارِ زمانہ کے مقیاس پر ہوں اور ان کا اسلوبِ بیان اس درجہ دلکش ہو کہ اگر ادبی مذاق رکھنے والے حضرات ان مضامین کو محض ذوقِ ادب کی رعایت سے ہی پڑھنا شروع کر دیں تو بھی چھوڑنے کو جی نہ چاہے اور جب وہ انہیں ختم کریں تو غیر محسوس طور پر پڑھنے والے کے قلب پر وہ ایک ایسا اثر چھوڑ جائیں جو الحاد و کفر نوازی کے تمام شکوک و شبہات کو رفع کر کے ان کے دل میں یہ یقین پیدا کر دے کہ فی الواقعہ قرآنِ کریم خدا کی کتاب ہے اور نوعِ انسانی کی ہر مشکل کا حل ذہنِ انسانی کی ہر سطح کے مطابق اس کے اندر موجود ہے۔"

اس کے بعد رسالہ کے انتظامی امور کے متعلق کچھ تذکرہ تھا اور اخیر میں لکھا تھا:۔

"لیکن یہ تمام انتظامات اور ان سے متعلقہ مساعی، یہ تمام تدابیر اور ان کی جز رسی، یہ ولولے اور یہ ارادے، یہ تجاویز اور ان کی تکمیل کے لئے کوششیں، یہ مقاصد اور ان کے حصول کے لئے ذرائع۔ یہ سب انسانی دماغوں کی تخلیق ہیں۔ جو نہ غلطیوں سے مبرا ہیں اور نہ سہو و فروگزاشت سے منزہ، جنہیں نہ کل کے آنے والے واقعات کا علم ہے، نہ اس پر تصرف و قدرت! لہٰذا یہ تمام انسانی کوششیں پرکاہ جتنا بھی وزن نہیں رکھتیں اگر اس خدائے حی و قیوم کا فضل اور اس کی رحمت شاملِ حال نہ ہو کہ موت و حیات، کامیابی و ناکامی، فلاح و خسران اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اس کی اعانت شریکِ کار ہو تو ادنیٰ سے ادنیٰ کوشش اور کمزور سے کمزور حرکت وہ نتیجہ پیدا کر دے کہ بڑے سے بڑے ساز و سامان رکھنے والے انگشت بدنداں رہ جائیں اور اگر وہی شاملِ حال نہ ہو تو دنیا بھر کی قوتیں اور ان کا ہجوم ایک ذرہ کو بھی اپنی جگہ سے نہ ہلا سکے۔ اس لئے مجھ و سہ نہ اپنی تجاویز و تدابیر پر ہے نہ قوت و استعداد پر۔ مجھ و سہ فقط اس کی ذات پر ہے جو ہر کمزور و ناتواں کا حقیقی آسرا۔ اور ہر نحیف و زار کا یقینی ملجا ہے۔ بازارِ مصر میں ایک ضعیفہ کی سوت کی انٹی یقیناً ہر صاحبِ دولت و حشمت کے چہرے پر ایک حقارت کی ہنسی کے آثار پیدا کر دیتی ہے۔ لیکن چہ عجب کہ اس کے دربار میں جہاں قیمتوں کے معیار بالکل جداگانہ ہوتے ہیں، اسی انٹی کی قیمت دولتِ کونین سے بڑھ جائے۔ رد و قبول تو اس کی مشیت پر موقوف ہے۔ لیکن ممکن ہے کہ سادہ دلی کی یہ جرأت ہی کسی کی شانِ استغناء میں ترحمِ خسروانہ کا ایک ہلکا سا تبسم پیدا کر دے، کہ یہ بے بضاعتی ملاحظہ ہو۔ اور اس کے ساتھ یہ امنگیں اور یہ ولولے! بہرحال جو کچھ ہمارے پاس ہے اسے لے کر اس شاہنشا

گداؤں کے آستانے پر حاضر ہورہے ہیں اس التجا کے ساتھ کہ ؎

کوہ آتش خیز کن این کاہ را — ز آتشِ ما سوز غیر اللہ را

رہرواں را منزلِ تسلیم بخش — قوتِ ایمانِ ابراہیمؑ بخش

ان دعاؤں اور التجاؤں کے ساتھ یہ پہلا قدم اس کے راستہ میں اٹھایا جارہا ہے۔

"رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ"

ان حسین آرزوؤں اور مقدس تمناؤں کے ساتھ طلوعِ اسلام کا اجراء ہوا۔

(۰)

شعلۂ جوالہ

حرکت مسلمان کی فطرت میں داخل ہے۔ سیمابیت اس کے ہیولیٰ میں شریکِ غالب کا حکم رکھتی ہے۔ اگر کہیں خارجی اسباب و علل اس کے شعلۂ جوالہ کو آتشِ خاموش میں تبدیل بھی کر دیں، تو بھی اس کی کیفیت یہ رہتی ہے کہ ذرا سی ہوا دینے سے چھپی ہوئی چنگاری پھر سے بھڑک اٹھتی ہے۔ اس کے بربطِ ہستی کے بظاہر خاموش تاروں کو جذبات کے مضراب سے ذرا چھیڑ کر دیکھئے، پوشیدہ نغمے کس بیتابیوں سے نکلتے اور فضا کو مرتعش کرتے ہیں۔ سنہ ۱۹۱۸-۱۹ء میں ہندوستان میں اس تحریک کی ابتدا ہوئی جسے بظاہر جنگِ آزادی کا نام دیا گیا۔ لیکن جو بباطن اس ملک میں ہندو راج کے قیام کے منصوبوں پر مبنی تھی۔ ہندو لیڈروں نے نہایت گہرائی میں جا کر حالات کا جائزہ لیا۔ انکی نگہ باریک بیں نے مسلمان کی فطرتِ سیمابیت کو بھانپا اور اس سے فائدہ اٹھانے کی تدابیر سوچی۔ مسلمان مذہب کے نام پر مستانہ وار اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اس نے اپنی تحریک کا دامن تحریکِ خلافت کے ساتھ باندھ دیا۔ "دیوانہ را ہوئے بس است" ہوگیا تھا۔ مسلمان بگولے کی طرح اٹھ کھڑا ہوا اور ہندوستان کے طول و عرض میں ایک طوفان بپا کر دیا۔ سنہ ۱۹۱۸-۱۹ء سے سنہ ۱۹۳۸ء تک اس کی یہی کیفیت رہی۔ ایک حرکت تھی لیکن بلا مقصد۔ ایک سفر تھا لیکن بلا تعینِ منزل۔ اس کے سامنے کوئی نصب العین نہ تھا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ یہ تمام جوش و خروش، یہ وجد و رقص بالآخر ہے کس لئے۔ "چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ" یہ تھا اس کا معمول۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں الٰہ آباد کے مقام پر اس مردِ مومن (علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ) نے جسے مبداءِ فیض کی کرم گستری نے فراستِ ایمانی و بصیرتِ قرآنی سے نوازا تھا، ان کے سامنے، ان کی حرکت و عمل کے لئے ایک واضح نصب العین رکھا۔ لیکن جوش و خروش کے زمانہ میں ان باتوں پر کان کون دھرتا ہے؛ بہتوں نے اسے سنا تک نہیں، اور جس نے سنا اس نے بھی اسے ان سنی کر دیا۔ سنہ ۱۹۳۸ء تک مسلمانانِ ہند کی یہی کیفیت رہی تاآنکہ اس مردِ قلندر کی دور بیں نگاہوں نے ایک ایسے معتدل مزاج مدبّر کو بھانپا جس میں قوم کو اس واضح اور درخشندہ نصب العین کی طرف لے جانے کی صلاحیت تھی۔ اس سے مسلمانانِ ہند کی سیاسی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ وہ اصول و مبانی جن سے اس نئے دور کا آغاز ہوا بالکل صاف اور سادہ تھے۔ یعنی:

اساسات

(۱) اسلام کی رو سے قومیت کا مدار مذہب پر ہے۔ جغرافیائی حدود۔ وطن کی چار دیواری، زبان اور نسل کا اختلاف، سب غیر فطری امتیازات ہیں۔ نوعِ بشری کی تقسیم صرف ایک

معیار پر ہو سکتی ہے۔ یعنی تمام وہ لوگ جو نظامِ خداوندی کے تابع زندگی بسر کرنے کا عہد کریں، ایک قوم کے افراد ہیں اور ان کے سوا تمام انسان دوسری قوم کے افراد۔ اسی کا نام ایمان اور کفر ہے۔ اسی تقسیم کو خدا نے حزب اللہ اور حزب الشیطان کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔

(۲) اس معیارِ تقسیم کی رُو سے ہندوستان کے دس کروڑ مسلمان ایک جداگانہ، مستقل قوم کے افراد ہیں۔ ہندو اور مسلمان مل کر ایک قوم کسی طرح نہیں بن سکتے۔

(۳) مسلمانوں کے نزدیک آزادی کے مفہوم یہ نہیں کہ غیر ملک کے حکام (انگریز) یہاں سے نکل جائیں اور ان کی جگہ یہاں کی ہندو اکثریت کی حکومت قائم ہو جائے۔ ان کے نزدیک یہ بھی اسی طرح کی غلامی ہوگی جس طرح انگریز کی حکومت ان کے لئے غلامی ہے۔ آزادی سے ان کا مفہوم یہ ہے کہ یہ اپنے تصورات و معتقدات کے مطابق زندگی بسر کرنے پر قدرت رکھیں اور دنیا میں قرآنی نظام رائج کر سکیں۔

(۴) یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ان کا ایک مستقل مسکن (HOME LAND) ہو کیونکہ ہر ریاستی نظام کے قیام کے لئے زمین کا ہونا لازمی ہے۔

(۵) ہندوستان کی موجودہ شکل میں اس کی آسان صورت یہ ہے کہ مغربی اور مشرقی علاقوں میں جہاں حسنِ اتفاق سے مسلمانوں کی اکثریت ہے، ان کی الگ اور قائم بالذات حکومت ہو جائے۔ اسی کا نام تقسیم ہند ہے۔ ہندو لیڈر تقسیم ملک کے الفاظ تک سننے کیلئے تیار نہیں تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ ہندوستان شروع سے ایک ملک چلا آرہا ہے اس لئے وہ ایک ملک ہی رہیگا۔ انہوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ بھارت تو ان کے نزدیک ماتا (ماں) ہے وہ اسے کس طرح برداشت کر سکتے ہیں کہ ان کی ماتا کے ٹکڑے ہو جائیں ـــــ چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کے اس حق و عدل پر مبنی دعوے کی مخالفت شروع کی اور چونکہ مسلمانوں کے ان تمام دعاوی و مطالبات کا مدار اس بنیاد پر تھا کہ مذہب کی رُو سے وہ ایک الگ قوم ہیں، انہوں نے یہ چلانا شروع کر دیا کہ مذہب ایک نجی (PRIVATE) عقیدہ کا نام ہے جسے سیاست سے کوئی واسطہ نہیں ہونا چاہیئے۔

ہندوؤں کی طرف سے تو یہ مخالفت ہونی ہی تھی لیکن ہماری بدبختی، کہ خود مسلمانوں میں بھی ایسے لوگ انہیں مل گئے جو مسلمانوں کے ان مطالبات کی مخالفت میں ان کے ہمنوا ہو گئے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ان کے اس طرزِ عمل سے تحریکِ پاکستان کو شدید نقصان پہنچانے والے مؤرخ کے لئے یہ منظر بھی حیرت و استعجاب کی عجیب کیفیات پیدا کرے گا، کہ مسلمانوں کے اس دعویٰ کی وکالت کرنے والا ایک ایسا شخص تھا جسے امورِ دینیہ کے عالم ہونے کا کبھی دعویٰ نہ ہوا۔ اور اس کی مخالفت میں وہ گروہ پیش پیش تھا جو اپنے آپ کو "عاملانِ دینِ مبین اور مفتیانِ شرعِ مبین" کے القابات سے متعارف کراتا تھا! آپ غور کیجئے تو یہ حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آجائے گی کہ مسلمانانِ ہند کی گذشتہ دس سال کی تگ و تاز اور جد و جہد خود اپنوں کی مخالفت کا مقابلہ کرنے میں صرف ہو گئی۔ طلوعِ اسلام کی جد و جہد میں بھی روئے سخن زیادہ تر انہی حضرات کی طرف رہا اور اس باب میں اس کی مساعی جس انداز سے مشکوک ہوئیں اس کے لئے ہم اس بارگاہِ صمدیت کے حضور قدم قدم پر سجدہ ریز ہیں کہ اس کی توفیق و نصرت کے بغیر اس ہجومِ مخالفت کا مقابلہ کسی طرح بھی ممکن نہ تھا۔ یہ لوگ عوام کو یہ کہہ کر دھوکا دیتے تھے کہ جس آزادی کے طالب ہندو ہیں، اس میں

سوراجی اسلام

مسلمانوں کو پوری مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ لہٰذا سب سے پہلے یہ بتانا ضروری تھا کہ مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا صحیح مفہوم کیا ہے اور جس قسم کے مذہب کی آزادی ہندو اکثریت کی حکومت میں حاصل ہو سکتی ہے اس کی حقیقت کیا ہے۔ اس کے لئے جون ۱۹۳۸ء میں راقم الحروف کے قلم سے ایک مبسوط مقالہ بہ عنوان "سوراجی اسلام" شائع ہوا جس نے فریقِ مخالف کی اہلِ فریبیوں کے نقاب کی دھجیاں بکھیر دیں۔ والحمد للہ رب العالمین۔

———(٥)———

واردھا کی تعلیمی سکیم

اگست ۱۹۳۸ء کے طلوعِ اسلام کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے :-

"تاریخِ عالم کے زمانۂ قدیم پر نگاہ ڈالیئے تو آپ کو نظر آئے گا کہ قوت و سطوت کی مالک قومیں دوسری قوموں کو تباہ و برباد کرنے کے لئے قتل و غارت گری اور کشت و خون کے کیا کیا طریقے اختیار کرتی ہیں۔ چنگیز خان و ہلاکو کی خونچکاں داستانیں صفحاتِ تاریخ پر خون کے حروف میں لکھی ملتی ہیں۔ فرعون و نمرود، شداد و ہامان کے جور و استبداد کے واقعات پڑھنے والے کی روح میں کپکپی پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ دورِ جہالت تھا، علانیہ سبعیت و بربریت کا زمانہ تھا، عصرِ حاضر کا مہذب انسان اس دورِ وحشت کو سخت نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اپنے زمانہ کو خدا کی رحمتوں اور برکتوں کا زمانہ سمجھتا ہے کہ جس میں قتل و خونریزی کی وہ داستانیں نہیں دہرائی جاتیں جس میں انسانیت تڑپتی، بلکتی، پھڑکتی نظر آئے۔ لیکن جو لوگ حقائق کو گہری نظر سے دیکھتے ہیں ان پر یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے کہ عصرِ حاضر کا مہذب انسان بھی دوسروں کی ہلاکت و بربادی میں عہدِ جہالت کے وحشی انسان سے کسی حالت میں کم نہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ عہدِ جہالت میں تھا جس میں انسان نے ابھی یہ نہیں سیکھا تھا کہ اپنی ستم کوشیوں اور ظلم رانیوں کو کس طرح اصلاح و بہبود کے خوش آئند نقاب اڑھائے۔ وہ جو کچھ کرتا تھا کھلم کھلا کرتا تھا۔ بتا کر، جتا کر، دکھا کر کرتا تھا۔ لیکن آج انسان عقل و حکمت میں بہت ترقی کر چکا ہے۔ آج اسی طرح کھلم کھلا ہوسِ خون آشامی کو پورا کرنا حماقت سمجھا جاتا ہے۔ آج سب سے زیادہ مدبر، سب سے زیادہ ہوشیار وہ ہے جو دوسروں کا خون اس انداز سے پی جائے کہ اس کا دھبہ تک نظر نہ پڑے۔ وہ دوسروں کی متاعِ حیات کو اس مشفقانہ انداز سے لوٹ لے کہ اس پر رہزن و قزاق ہونے کا شبہ تک نہ ہو، وہ ناصح و مصلح کے معصوم لباس میں قوم کی قوم کو تباہ کر جائے۔ درین حالت کہ لٹنے والوں کو پتہ ہی نہ چلے کہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ دورِ جہالت کا وحشی اور ظالم انسان آج تک بدنام چلا آتا ہے کہ اس کے جور و ستم کی ہلاکت آفرینیاں گویا ایک طوفانِ بلاخیز ہیں جو کف بر دہان بڑھتا، امڈتا، بپھرتا چلا آتا ہے کہ جس کی طغیانیوں کو اندھے بھی دیکھتے ہیں اور جس کی شورانگیزیوں کو بہرے بھی سنتے ہیں۔ لیکن دورِ حاضر کے مہذب انسان کی استہلاک و تخریب کی چالیں ایک پُرسکوت دریا کی مانند ہیں جس کی روانیوں میں نہ شور ہے نہ تموج۔ لیکن سطحِ آب کے نیچے ایسے ایسے خوفناک مگرمچھ چھپے ہوتے ہیں کہ قوم کی قوم کو تباہ کر دیں۔ لیکن نہ دیکھنے والی آنکھیں دیکھ سکیں اور نہ سننے والے کان

سن سکیں۔ اس پُرسکوت طریقِ تخریب اور اس آتشِ خاموش میں سب سے بڑا حصہ تعلیم کو حاصل ہے۔ آپ جس قوم کو تباہ و برباد کرنا چاہیں، نہایت خاموشی سے اُس کے طریقِ تعلیم کو بدل دیجئے، وہ رفتہ رفتہ غیر محسوس طور پر ہلاکت و بربادی کے عمیق و مہیب غاروں میں کھنچے چلی جائے گی اور اسے پتہ اس وقت چلے گا جب وہ سکراتِ موت کی ہچکیاں لے رہی ہوگی۔ اکبر مرحوم نے اس جانکاہ حقیقت کو کس بلیغ اور اپنے مخصوص انداز میں بیان کیا ہے کہ ؎

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی!

تعلیم کی یہ اہمیت، ہندو قوم کے بالعموم اور ان کے بلند ترین لیڈر، مسٹر گاندھی کے بالخصوص پیشِ نظر تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کی آئندہ نسلوں پر حکومت کرنا ممکن نہ ہوگا جب تک ان کے ذہنی تصوّرات کو نہ بدل دیا جائے اور اس کی آسان ترین شکل یہ ہے کہ ان کے نصابِ تعلیم کو بدل دیا جائے۔

چنانچہ اس مقصد کے پیشِ نظر ایک تعلیمی کمیٹی کی تشکیل ہوئی جس نے شروع ۱۹۳۸ء میں اپنی رپورٹ پیش کی۔ اس سکیم کا نام "وارد ھا تعلیمی سکیم" تھا۔ اس سکیم میں ایسے ایسے زہریلے نشتر چھپا رکھے تھے کہ اگر یہ خدانہ کردہ کہیں مسلمانوں میں رائج ہو جاتی تو یہ نشتر ان کی آئندہ نسلوں کے رگِ جان میں پیوست ہو جاتے۔ اگست ۱۹۳۸ء کے طلوعِ اسلام میں اس دامِ ہمرنگِ زمین کا اس وضاحت سے تجزیہ کیا گیا کہ وَمَكَرُوا وَمَكَرَ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ۔ (ان کی خفیہ تدبیریں سب برباد ہوگئیں) کی تفسیر سامنے آگئی۔ جس اقتباس سے اس عنوان کی ابتداء ہوئی وہ اس مضمون کا افتتاحیہ ہے۔ ادارہ طلوعِ اسلام نے اپنے پیشِ نظر اسلوبِ اشاعت یہ رکھا تھا کہ اس قسم کے اہم مضامین کو الگ پمفلٹ کی شکل میں شائع کر دیا جاتا تھا۔ چنانچہ اس مضمون کا پمفلٹ ملک کے طول و عرض میں پھیلا دیا گیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں مختلف زبانوں میں اس کے تراجم شائع ہوئے۔ پشتو، گجراتی، ہندی، ملیالم، سندھی وغیرہ۔ اندازہ یہ ہے کہ اس مضمون کے قریب اسی ہزار پمفلٹ ملک میں تقسیم ہوئے اور نتیجہ اس نشر و اشاعت کا یہ ہوا کہ سکیم بُری طرح سے ناکام رہی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى ذَالِكَ۔

(۰)

تعلیم بدلنے کے ساتھ ہی زبان بدلنے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کی جداگانہ ہستی کو مٹانے کے لئے جو پروگرام وضع کیا گیا تھا اس میں زبان کی غیر محسوس تبدیلی کو خاص اہمیت دی گئی تھی۔ سیدھا سادا مسلمان اس حسین فریب سے قطعاً ناآشنا تھا۔ اسے اس عظیم خطرہ سے آگاہ کرنے کے لئے اکتوبر ۱۹۳۸ء کے طلوعِ اسلام میں "زبان کا مسئلہ" کے عنوان سے ایک مفصل مقالہ شائع ہوا جس کی تمہید ان الفاظ سے ہوئی۔

زبان کا مسئلہ

"وارد ھا اسکیم والے مضمون میں ہم بصراحت لکھ چکے ہیں کہ اس آئینی تبدیلیوں کے زمانہ میں ہندوؤں کے پیشِ نظر سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ جوں جوں ملک کی حکومت ان کے ہاتھ میں آتی جائے وہ ایسی تدابیر اختیار کریں جن سے ہندوستان میں مسلمان من حیث القوم زندہ نہ

رہ سکیں۔ مسلمانوں کا الگ قومی تشخص انہیں کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے۔ کیونکہ ہندوستان میں جتنی قومیں باہر سے آئیں اور جنہوں نے یہاں بود و باش اختیار کی ان میں سے صرف مسلمان ہی ایک ایسی قوم ہے جسے یہ "اکال الامم" اپنے اندر جذب نہیں کر سکا۔ ورنہ ان کے علاوہ سب کے سب رفتہ رفتہ یہاں پہنچ کر ہندو ہو گئے۔ مسلمانوں انفرادیت مٹانے کے لئے ہندو پوری قوت سے سرگرم عمل ہے اور اس کے لئے اس نے طریق کار وہ اختیار کیا ہے جسے ہم نے دریا کی پُرسکون روانیوں سے تشبیہ دی تھی۔ میدانِ سیاست میں "متحدہ قومیت" کی حسین تشکیل کا تصور پیش کیا جا رہا ہے اور اس کے بھیانک اور خطرناک نتائج و عواقب کو (جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے)۔ "بدیشی حکومت کے خاتمہ" کے دلفریب نقاب میں پوشیدہ رکھا جاتا ہے۔ اختلافِ مذاہب چونکہ "ہندو مسلم اتحاد" کے راستہ میں روڑا اٹکاتا ہے اس لئے مذہب کو سیاست سے الگ رکھنے کا معصوم سبق دیا جا رہا ہے۔ مسلمانوں کا یہ ایمان کہ اسلام تمام ادیانِ عالم پر فوقیت رکھتا ہے، چونکہ بچوں کے قلب و دماغ کو "تنگ نظری اور تعصب" کے زہر سے مسموم کر دیتا ہے اس لئے درس گاہوں میں ایک ایسے مذہب کی تعلیم کی تجویز کی جا رہی ہے جو اکبر کے دینِ الٰہی۔ یعنی دورِ حاضرہ کے برہمو سماج کے خطوط پر متشکل ہے۔ اہمسا کے مسلک سے چونکہ سبعیت و بربریت کے خونخوار جذبات کی انگیخت ہوتی ہے اس لئے اس کی جگہ اہمسا کا فلسفۂ حیات جنتِ قلب و نظر بنا کر پیش کیا جا رہا ہے اور تعلیم کے ان تمام عناصر کو، "روٹی" کے دلکش غلاف میں لپیٹ کر ایسا خوش آئند "منبوسہ" بنا دیا گیا ہے کہ جو دیکھے لپک کر اٹھا لے۔ اسی مقصد کے حصول کے لئے اُردو کی جگہ ہندی زبان کی ترویج ہو رہی ہے اور اصل مقصد کو نگاہوں سے اوجھل رکھنے کے لئے کہا یہ جاتا ہے کہ متحدہ قومیت کے لئے ایک مشترکہ زبان کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ مسلمان اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں اور انہیں اس غلط فہمی میں اور زیادہ مبتلا کیا جا رہا ہے کہ زبان

مسئلہ کی اہمیت

کا مسئلہ محض ایک ادبی مسئلہ ہے۔ کسی قوم کے مذہب اور تہذیب سے اس کا کیا تعلق؟ لیکن انہیں یہ معلوم نہیں کہ کسی قومیت کو بنانے اور بگاڑنے میں، کسی تہذیب کو زندہ رکھنے اور فنا کر دینے میں، کسی قوم کا مذہب سے تعلق باقی رکھنے اور منقطع کر دینے میں، زبان کا غیر معمولی اثر ہوا کرتا ہے۔ جس قوم کے پاس اپنی زبان اور اپنا رسم الخط ہے، وہ ایک مستقل قوم ہے اور جس قوم کی زبان میں خود اپنا لٹریچر موجود ہے اور ترقی کر رہا ہے وہ ایک زندہ قوم ہے۔ جس وقت وہ قوم اپنی زبان چھوڑنے اور اپنا رسم الخط بدل دینے پر آمادہ ہو جائے اس وقت سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ اپنی قومیت کو بدل رہی ہے اپنی تہذیب سے رشتہ منقطع کر رہی ہے اپنی قبر اپنے ہاتھوں کھود رہی ہے۔ غیر محسوس طور پر تباہی اور بربادی کے عمیق غاروں کی طرف کھینچی جا رہی ہے۔

یہ ایک "تنگ نظر" مسلمان ہی کا خیال نہیں ہے بلکہ "کشادہ ظرف" ہندو بھی اس کے مؤید ہیں۔ چنانچہ پنڈت جواہر لال نہرو اپنے ایک مضمون میں فرماتے ہیں:۔

ایک قوم کے لئے زبان کا مسئلہ بڑا اہم ہے۔ آج سے تین سو برس پیشتر ملٹن نے فلورنس سے ایک دوست کو خط لکھتے ہوئے اس کی اہمیت کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا۔ کسی قوم کے اپنی ایک زبان رکھنے کو خواہ

وہ زبان بگڑی ہوئی ہو یا خالص ہو، ایک غیر اہم سا واقعہ نہ سمجھ لینا چاہیئے اور نہ ہی اس امر کو اس کے افرادِ زبان کے برتنے میں صحت کا کہاں تک لحاظ رکھتے ہیں۔ کوئی تاریخی شہادت ایسی نہیں ملتی کہ کوئی سلطنت یا مملکت اس وقت تک اوسط درجہ کی خوشحالی و فلاح سے محروم کر دی جا سکتی ہو جس وقت تک اس کے افراد اپنی زبان کو پسند کرتے اور اس کی طرف کافی توجہ کرتے رہے ہوں۔"

ایک دوسری جگہ پنڈت جی فرماتے ہیں:-

"رسم الخط اور ادب کا بہت گہرا تعلق ہے اور رسم الخط کی تبدیلی اس زبان کے لئے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے جس کا ماضی شاندار رہا ہو۔ رسم الخط بدلنے کے ساتھ الفاظ کی شکلیں بدل جاتی ہیں، آوازیں بدل جاتی ہیں اور خیالات بدل جاتے ہیں۔ قدیم و جدید ادب کے درمیان ایک ناقابلِ عبور دیوار حائل ہو جاتی ہے اور قدیم ادب ایک ایسی اجنبی زبان کا ادب بن کر رہ جاتا ہے جو مردہ ہو چکی ہو۔" (میری کہانی۔ جلد اوّل ص۲۹۵)

ان الفاظ کو ذرا غور سے پڑھیئے اور انہیں دل کی گہرائیوں میں جگہ دیجئے کیونکہ اس مضمون میں ان کی طرف بار بار توجہ کرنی پڑے گی۔"

اس مضمون کا پمفلٹ بھی بار بار چھپا اور اطراف و جوانب میں پھیل گیا۔

(۰)

متحدہ قومیت اور مولانا حسین احمد مدنی

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، اس سیاسی کش مکش کے دور میں سب سے اہم اور بنیادی مسئلہ نظریۂ قومیت تھا۔ ۱۹۳۸ء کے آغاز میں اس نظریہ سے متعلق ایک اہم بحث کا سلسلہ چھڑا۔ بات یوں ہوئی کہ "مولانا" حسین احمد صاحب، شیخ الحدیث، دارالعلوم دیوبند نے اپنی تقریر کے دوران فرمایا کہ "اس زمانہ میں قومیتیں اوطان سے بنتی ہیں مذہب سے نہیں بنتیں۔" چونکہ یہ نظریہ اسلام کے شجرِ طیّب کی جڑ پر تبر چلانے کے مرادف تھا اور پیش ہو رہا تھا ایک ایسے گوشے سے جسے مسلمانوں کی دینی تعلیم کی مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اس لئے ملّتِ اسلامیہ کے قلبِ حسّاس میں اس سے ایک ٹیس پیدا ہوئی اور آہ و آتشیں کی شکل میں ان الفاظ میں لب تک پہنچی کہ ؎

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ — زدیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود برسرِ منبر کہ ملّت از وطن است — چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی است!
بمصطفٰے برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است! (علامہ اقبالؒ)

جناب حسین احمد صاحب، بجائے اس کے کہ ان اشارات سے متنبہ ہو جاتے اور اپنی غلطی کا اعتراف فرما لیتے، اُلٹے فعل برآتش ہو گئے اور اپنے نظریہ کی تائید میں ایک لمبا چوڑا بیان شائع کر دیا جس میں فرمایا کہ

یہ دعویٰ کہ اسلام کی تعلیم، قومیت کی بنیاد، جغرافیائی حدود، یا نسلی وحدت یا رنگ کی یکسانی کے بجائے، شرفِ انسانی اور اخوتِ بشری پر رکھتی ہے، مجھے معلوم نہیں کہ کونسی نصِ قطعی یا ظنی سے ثابت ہے۔

علامہ اقبالؒ پر ان دنوں مرض الموت کے سخت دورے پڑ رہے تھے لیکن معاملہ کی نزاکت اور اہمیت کے احساس نے انہیں مضطرب و بے قرار کر دیا اور نظریۂ قومیت کے متعلق انہوں نے وہ بیان شائع فرمایا جو اس باب میں قولِ فیصل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ بیان ایسا مسکت و جامع تھا کہ جناب حسین احمد صاحب کو یہ کہنا پڑا کہ "میرا مقصد دہلی کی تقریر میں اخبار تھا، انشاء نہ تھا" بات ختم ہو گئی۔ لیکن علامہ اقبالؒ کی وفات کے قریب چھ ماہ بعد جناب حسین احمد صاحب مرحوم کے متذکرہ صدر بیان کی تردید میں ایک پمفلٹ بعنوان "متحدہ قومیت اور اسلام" شائع کر دیا۔ طلوعِ اسلام نے اپنا فریضہ سمجھا کہ اس کے جواب میں قرآن کریم کے نظریۂ قومیت کو وضاحت سے بیان کر دیا جائے تاکہ ملتِ اسلامیہ اس کے برعکس غلط تعلیم کے مسموم اثرات سے محفوظ رہ جائے۔ چنانچہ جنوری ۱۹۳۹ء کے رسالہ میں اس عنوان پر ایک مبسوط و جامع مقالہ شائع ہوا جس کا جواب کسی سے بن نہ پڑا۔ اور یہ سب اللہ کی توفیق سے ہوا۔

(۔)

اس سیاسی کش مکش کا سلسلہ یونہی جاری رہا۔ ملتِ اسلامیہ کی اکثریت مسلمانوں کی جداگانہ قومیت اور الگ حکومت کے دعوے کی تائید میں تھی لیکن "قومیت پرست" گروہ ان کی مخالفت میں دن رات مصروف تھا اور یا للعجب کہ اس مخالفت میں جمعیۃ العلمائے ہند صفِ اوّل میں تھی۔ آٹھ نو برس ہو چکے تھے کہ جمعیت کا کوئی سالانہ اجتماع نہیں ہوا تھا لیکن اس مخالفت کے جوش نے ان میں پھر سے حرکت پیدا کی اور اوائلِ مارچ ۱۹۳۹ء میں دہلی میں ان کا اجتماع ہوا۔ یہ بڑا نازک وقت تھا اور ایسے وقت میں مسلمانوں کے ملّی مطالبہ کی مخالفت میں ایک ایسا اجتماع خاص اہمیت رکھتا تھا۔ طلوعِ اسلام کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ اپنے ان بھائیوں کو سیدھا راستہ دکھانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔ چنانچہ اس اجتماع کی تقریب پر اس کی طرف سے ایک جامع مقالہ بعنوان "عرضداشت بخدمتِ علمائے کرام" شائع ہوا اور جلسے کے پہلے دن خاص اہتمام سے اسے مفت تقسیم کیا گیا۔ اللہ نے اس کی اس کوشش کو مشکور فرمایا۔ اور عوام اس فریب کا شکار ہونے سے بچ گئے جو اس معصوم انداز سے کھیلا جا رہا تھا۔

(۔)

پہلی سالگرہ

اسطرح طلوعِ اسلام کی زندگی کا پہلا سال ختم ہوا، اور دوسرے سال کی ابتداء ان دعاؤں اور التجاؤں کے ساتھ کی گئی۔

"اس خدائے حیّ و قیوم کے نام سے جو حیات و قوت کا سرچشمہ اور زندگی و توانائی کا مبداء ہے، طلوعِ اسلام اپنی عمر کے دوسرے سال میں اس "شکر و شکایت" کے ساتھ قدم رکھتا ہے کہ ؎

میں بندۂ ناداں ہوں مگر شکر ہے تیرا — رکھتا ہوں نہاں خانۂ لاہوت سے پیوند
اِک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو! — لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند

تاثیر ہے یہ میرے نفس کی کہ خزاں میں!
مرغانِ سحر خواں میری صحبت میں ہیں خورسند

لیکن مجھے پیدا کیا اُس دیس میں تُو نے
جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضامند

شکر اور بے پایاں شکر اس کی توجہاتِ کرم کا، اور شکایت اور بے غایت شکایت اس تقدیر کی جس کے خلاق خود ہمارے اپنے اعمال ہیں اور جس کی وجہ یہ بکھرا ہوا نظام ہے۔ بہرحال یہ بھی اُسی کے گوشۂ التفات کا تصدق ہے کہ اس جاہلیت کی جہنمی زندگی کا احساس تو ہو گیا جو ایک عرصہ سے جنتِ نگاہ بن رہی تھی۔ دعا ہے کہ جب یہ احساس دیا ہے تو اس زندگی کو بدل ڈالنے کی توفیق بھی عطا کر دے ؎

بیا ساقی! بگرداں جامِ مے را
زنے سوزندہ تر کن سوزِ نے را

دگر آں دل بنہ در سینۂ من!
کہ بینم پنجۂ کاؤس و کے را

زندگی نام ہے آرزو کا ——— آرزو جس قدر زندہ ہو، زندگی اتنی ہی تابندہ ہوتی ہے۔ طلوعِ اسلام زندہ آرزوؤں اور درخشندہ تمناؤں کی ایک حسین جنّت در آغوش، اس شاہنشاہِ دوعالم کے آستانۂ اقدس پر جھولی پھیلائے کھڑا ہے جس کے ابرِ جود و سخا کی گوہر باریوں سے ہر خشک ٹہنی بہارِ صد گلستاں بداماں ہے۔ چہ عجب کہ اس کی عاجز نوازیوں سے اس کی شاخِ تمنا بھی سرسبز ہو جائے۔

ارادے نہایت بلند ہیں لیکن ان کی تکمیل۔ اے چارہ سازِ بے کساں! صرف تیرے ہاتھ ہے۔ عزائم بڑے راسخ ہیں لیکن ان کی برآوری، اسے مدد فرمائے ناتواں صرف تیری عطا کردہ توفیق پر منحصر ہے۔ اے رب العزت! سہارا صرف تیری ذات کا سہارا ہے۔ آسرا، صرف تیرا آسرا ہے۔ باقی بتانِ آزری۔ جو کچھ ابھی ہماری دنیائے تخیلات میں ہے اسے محسوس پیکر عطا فرما دے۔ جو عالمِ تصور میں ہے اسے مشہود بنا دے بشرطیکہ جو کچھ ہم سوچتے ہیں وہ ہمارے لئے بہتر ہو۔ تیرے بتائے ہوئے راستے کے مطابق ہو۔ ایسے خوابوں کو حقیقت بنا دینا صرف تیرے اختیار میں ہے ؎

میں ہوں صدف تو تیرے ہاتھ میرے گہر کی آبرو
میں ہوں خزف تو تُو مجھے گوہرِ شاہوار کر

ان دعاؤں اور ان التجاؤں کے بعد ایک نصیحت اس "طفلکِ یکسالہ" (طلوعِ اسلام) کے لئے بھی ہے ؎

آفریدند اگر شبنمِ بے مایہ ترا
خیز و بر داغِ دلِ لالہ چکیدن آموز

اگرت خارِ گلِ تازہ رسے ساختہ اند
پاسِ ناموسِ چمن دار و خلیدن آموز

باغباں گر ز خیابانِ تو برکند ترا
صفتِ سبزہ دگر بار دمیدن آموز

تا تو سوزندہ تر و تلخ تر آئی بیروں
عزلتِ خمکدۂ گیر و رسیدن آموز

واللہ المستعان۔ علیہ توکلت و الیہ انیب۔
وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔"

——— (٠) ———